دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
الحق
ماہنامہ
زیر سرپرستی
شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبد الحق بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور
مغربی پاکستان

دارالعلوم حقانیہ کی شاندار مسجد

لہ دعوۃ الحق

قرآن و سنّت کی تعلیمات کا علمبردار

ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ
فروری ۱۹۷۰ء

جلد: ۵
شمارہ: ۵

ماھنامہ **الحق** اکوڑہ خٹک

مدیر ——— سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک

مغربی اور مشرقی پاکستان سے سالانہ -/۶ روپے، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ——— ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع و ناشر نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدر محترم آغا محمد یحیٰی خان نے راجشاہی میں خطاب کے دوران فرمایا۔ کہ ہمارے معاشرے کی بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اپنے عقیدے اور نظریئے کے بنیادی اصولوں کو نقصان پہنچائے بغیر سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں شامل ہو جائے، انہوں نے کہا کہ اسلام خود علم کے حصول و توسیع پر زور دیتا ہے اور بنیادی طور پر سائنس اور ہمارے عقیدے میں کوئی تضاد نہیں۔ صدر محترم کا سائنسی ترقی کے ساتھ عقیدے اور نظریئے کے تحفظ پر زور دینا ایک خوش آئند تبدیلی ہے جو پچھلے آمرانہ دور اور موجودہ اقتدار کے اندازِ فکر میں محسوس ہو رہی ہے۔ عصرِ حاضر کے فکر و نظر کی اصل گمراہی یہی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یا تو دین اور عقیدہ کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے یا اسے ثانوی حیثیت دی جائے، ہمیں مذہب کو موجودہ دور کے تقاضوں سے نہیں بلکہ موجودہ تقاضوں کو مذہب سے ہم آہنگ کرنا ہے، سائنس کو مذہب کی لگام لگا کر ہم موجودہ ترقی کی دوڑ میں منزل سے ہمکنار ہو سکتے ہیں، دین اور عقیدے سے بے لگام سائنس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ صدر ایوب خان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ فطرت کے ابدی حقائق، مذہب اور عقیدہ کو عصری تقاضوں کی قربان گاہ پر قربان کرنا چاہتا تھا حالانکہ مذہب انسان کیلئے نہیں بلکہ انسان مذہب (عبادت) کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور وہ ہر دور اور اسکے تقاضوں کو عبدیت کا طوق پہنا کر ہی مقصد تخلیق سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ سائنس اور مذہب کے موضوع پر سابق صدر کے خیالات کو سامنے رکھ کر ہم موجودہ صدر کے محتاط اور حقیقت پسندانہ خیالات کی تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتے، پچھلے دنوں ایسے ہی معتدلانہ خیالات کا اظہار ہمارے گورنر جناب نور خان بھی فرما چکے ہیں۔

★

سابق مرکزی وزیر قانون و پارلیمانی امور مسٹر ایس ایم ظفر نے، ہیری بنجمن اور آر ای ایل ماسٹرز کی لکھی ہوئی کتاب" دی پراسٹیچیوٹ ان سوسائٹی" کی اشاعت کے خلاف احتجاج کیا ہے، جس میں سرورِ کونین ؐ کے بارہ میں قابلِ اعتراض مواد موجود ہے، مرکزی وزارتِ داخلہ کے نام ایک خط میں انہ نے ایسی کتاب پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے، جس میں آنحضورؐ کی ذاتِ گرامی پر بدترین حملے کے

گئے ہیں، انہوں نے کہا یہ شر انگیز اور ہتک آمیز کتاب سخت ترین مذمت کی مستحق ہے "غیر مسلم اقوام کی ایسی ذلیل اور شرمناک جسارتوں پر جتنی بھی لعنت بھیجی جائے کم ہے، یورپ ایک مدت سے بعض اغراض کی خاطر یہ رسوا کن کھیل کھیل رہا ہے، مگر اصل علاج چند روزہ غوغہ آرائی نہیں، مسلم قوم تمام انبیاء اور پیشوایان مذاہب کی عظمت واحترام پر مجبور ہے، اور یورپ اس مجبوری سے غلط فائدہ اٹھا رہا ہے اگر مسلمان قوم بھی یورپی اقوام کی طرح مذہب واخلاق کے بندھنوں اور شرافت کے تقاضوں سے آزاد ہوتی تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا۔ لیکن مسلمان تو ہر حال میں صرف اپنے آقا خاتم النبیین علیہ السلام بلکہ سیدنا عیسیٰ المسیحؑ، سیدنا موسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء کی شان اعلیٰ وارفع کی تعدیل اور برأت کو مدار ایمان سمجھتا رہے گا جس امت کی کتاب اور دین نے اُن انبیاء کی پاکیزہ اور معصوم شان کی ناخلف امتوں کی دست درازیوں سے حفاظت وبرأت کا ذمہ لیا تو وہ برائی کا جواب بدی سے کب دے سکتی ہے۔

ہاں اس کا جواب اگر ہے تو یہی کہ کاش! مسلمانوں کے دست وبازو اتنے مضبوط اور عزم وایمان اتنا راسخ ہوتا کہ ایسی گستاخ زبان کو گُدّی سے نکال سکتا اور خیرہ چشمی پر اُن کی آنکھیں پھوڑ سکتا — سابق وزیر قانون کے احتجاجی بیان کی حرف بحرف تائید کرتے ہوئے ہم اپنی اس حیرت کو نہیں چھپا سکتے جو موصوف کے اس تازہ اور کچھ عرصہ قبل کے طرز عمل کو دیکھ کر ہمیں لاحق ہوئی، موصوف کے وزارت کے زمانہ میں ڈاکٹر فضل الرحمان نے بھی ایسی ہی ایک رسوائے زمانہ کتاب لکھی تھی اور اپنی "جرأت رندانہ" سے پوری ملت کو شدید اذیت پہنچائی تھی، نبی کریمؐ کی شانِ اقدس میں کیا کچھ نہیں تھا جو اس بیہودہ شخص نے نہیں لکھا تھا، ہم نے اسلامی کانفرنس کے دوران انٹرکانٹینٹل کے ایک بند کمرہ میں وزیر موصوف کی زبان سے بھی ڈاکٹر صاحب کے بارہ میں نہایت غلیظ ریمارکس سُنے تھے مگر چند دن بعد اخبارات کے صفحات پر اچانک وزیر صاحب موصوف ڈاکٹر صاحب کے وکیل صفائی بن کر ظاہر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کی مدافعت اور برأت میں پورا زورِ وکالت صرف کیا تھا — اس تضاد کی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے کہ موصوف کا وہ جذبۂ ایمانی اور حمیتِ اسلامی اب پابندِ قیدِ اقتدار نہیں رہا جس کی گرفت میں آکر بسا اوقات انسان کی "ایمانی حس" مصلحت پرستی اور حبِ جاہ اور خوف ولالچ کے دبیز پردوں میں دب کر رہ جاتی ہے مگر مقامِ عزیمت تو یہی ہے کہ قعرِ دریا میں رہ کر بھی انسان اپنے دامن کو تردامنی سے بچائے رکھے۔

⁂

الحق نہ کسی سیاسی پارٹی کا ترجمان اور نقیب ہے، نہ تنقید برائے تنقید اس کا شیوہ، لیکن اگر کتاب وسنت کی ترجمانی کا دعویدار ہے تو اس کا فرض ہے کہ جہاں اور جس پارٹی میں بھی اسے منکر

نظر آئے اپنی بساط کے مطابق بلا خوف ملامتِ لائم اس پر گرفت کرے اور اپنے اس جذبۂ نصیحت و فریضۂ اعلاءِ حق کو ذاتی اغراض کی آلائشوں سے پاک وصاف رکھے۔ اس وقت ملک ایک نازک دور سے گذر رہا ہے۔ سیاسی پارٹیاں میدان میں آچکی ہیں، الحق کا کسی پارٹی کی ناجائز مخالفت کرنا جسطرح جرم ہوگا اسی طرح کسی پارٹی کے ایسے کسی قول وعمل پر سکوت مجرمانہ بھی عند اللہ بہت بڑا جرم ثابت ہوگا جو مسلمانوں کے دینی وملی مزاج یا کتاب وسنت کے اصول سے متصادم ہو۔ اس وقت نیشنل عوامی پارٹی سرحد کے زیر اہتمام نکالے گئے۔ ایک جلوس کی تصویریں ہمارے سامنے ہیں جو یکم جنوری کے بعد جناح پارک اور پشاور کے بازاروں سے گزرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ یہ جلوس مردوں کا نہیں بلکہ خواتین کا ہے۔ مسلمان اور پشتون جیسے غیور اور جسور قوم کے سرکردہ قائدین کی خواتین کا ہے جو قومی وملی روایات پردہ نشینی کا آبگینہ بازار کے چوراہوں پر چور چور کرتا ہوا گزرتا جا رہا ہے۔ سیاسی شعور اور جذبہ حریت لائق ستائش ہے، مگر ہر عمل کا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ اور ابھی اس قوم پر ایسی نازک گھڑی نہیں آئی جسکی خاطر نفیرِ عام کی طرح حیادار خواتین بھی میدانِ سیاست میں کود پڑیں مسلمان عورت مجسّم عورت ہوتی ہے اسکی آواز اسکی جھلک اسکی پوری زندگی سراپا عصمت ہوتی ہے، پھر ایک ایسی قوم جس نے ان روایات کو اب تک اور بھی چار چاند لگا دئے ہوں، ان کے ہاتھوں عورت کا مردوں کے شانہ بشانہ دوڑتے اچھلتے کودتے رہنا اور اسٹیج پر داد خطابت دینا نہایت افسوسناک اور شرمناک بات ہے۔ ہم نیشنل پارٹی کے محترم قائدین سے خالص دینی اور قومی بلکہ علاقائی روایات کا بھی واسطہ دے کر اپیل کرتے ہیں کہ وہ آئندہ اس معاملہ میں محتاط رہیں ورنہ فتنہ کا دروازہ جب چوپٹ کھل جائے گا تو انہیں خود اپنے ہاتھوں اپنا سر پیٹنا پڑے گا۔ مگر تلافی کا وقت نکل چکا ہوگا تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر۔

★

اسی جذبۂ نصح وخیر خواہی کی بنا پر "جماعت اسلامی" سے بھی ایک گذارش کرنی ہے جو ہر قومی و ملی موڑ پر حکمت عملی کی آڑ میں فتنوں کا کوئی نہ کوئی دروازہ کھولدیتی ہے۔ حالانکہ ان کے قائد مودودی صاحب کے الفاظ میں "کسی مقصد کی برتری کیلئے صرف مقصد کا اعلیٰ ہونا کافی نہیں بلکہ اس تک پہنچنے کے ذرائع اور خطوط بھی بے لاگ اور پاکیزہ ہونے چاہئیں"۔ مگر عملاً ہم دیکھتے ہیں کہ مقصد برآری کی خاطر جماعت نہ صرف یہ کہ طریق کار کی صحت کا خیال نہیں رکھتی بلکہ دین کے ایک ایک اصول کو سیاست کے خراد پر چڑھا دیتی ہے، اس وقت جماعت اسلامی کا انتخابی منشور سامنے آچکا ہے۔ اس میں زراعت کے عنوان میں زمین کی ملکیت مغربی پاکستان میں سو اور دو سو ایکڑ کے درمیان اور مشرقی پاکستان میں ۱۰۰ ایکھ

تک محدود کر دی گئی ہے اور تمہید میں کہا گیا ہے کہ "غیر معمولی حالات میں ایسی غیر معمولی تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوں" قطع نظر اس بات کے کہ شریعت کا مذکورہ قاعدہ کن حالات اور کن غیر معمولی تدابیر پر منطبق ہوتا ہے۔ ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ شریعت اسلامیہ نے نہ تو زمین کے بارہ میں کسی قسم کی تحدید کی ہے اور نہ دیگر اموال و املاک میں انفرادی اور شخصی ملکیت کی کسی قسم کی حدبندی گوارا کی ہے۔ جائز اور حلال ذرائع سے جتنی بھی ملکیت حاصل کی جائے شریعت نہ صرف اُسے جائز بلکہ اللہ کی ایک نعمت قرار دیتی ہے۔ قرآن و حدیث ایسے نصوص و شواہد سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم نہ تو حالات کی نزاکت اور وقت کی رو میں بہہ کر انکی تاویل کر سکتے ہیں اور نہ سوشلزم کا ہوا کھڑا کر کے اس کے ڈر سے اسلام کے کسی مسئلہ میں تحریف اور تحدید کر سکتے ہیں۔ اسلام غیر محدود ملکیت سے نہیں روکتا، البتہ وہ مالک کو اللہ اور اُس کے بندوں کے حقوق کا پابند بنا کر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت ملکیت کی تحدید کرتا جاتا ہے، یہ زکوٰۃ و عشر، یہ صدقات اور ہبات اور سب سے بڑھ کر اسلام کا قانون میراث تحدید ملکیت نہیں تو اور کیا ہے مگر لامحدود کو محدود بنانے کا یہ منصوبہ قدرت ہی کا بنایا ہوا ہے، ہم اس میں نہ اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی، ہم مجرموں اور معاشرہ کی حق تلفی کرنے والوں کا ہاتھ توڑ سکتے ہیں، مگر انہیں کسی حلال کمائی کے ایک پیسہ سے نہیں روک سکتے۔ ہمیں حالات کا مقابلہ اور خرابیوں کی اصلاح کرنی ہے۔ مگر یہ اصلاح ایسی نہیں کہ دین کے کسی اصول پر قینچی چلا کر فساد کا ایک اور دروازہ کھول بیٹھیں۔ دین کا مسئلہ بہرحال اپنی جگہ رہے گا۔ جماعت اسلامی اسے ہماری ناعاقبت اندیشی سمجھے یا کچھ اور ہم تو اس "حکمت عملی" کو بہرحال دین کے لئے زہر قاتل سمجھیں گے۔ اگر جماعت اسلامی غیر معمولی حالات کی وجہ سے ۲۰۰ ایکڑ تک زمین کی تحدید کو غیر معمولی تدبیر اور دین کے اصول سے غیر متصادم سمجھتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ کل سوشلسٹ اور کمیونسٹ اسی دلیل سے ملکیت زمین کا حق قطعی طور پر چھین کر اسے "غیر معمولی تدبیر" اور دین کے اصول سے "غیر متصادم" قرار نہ دے بیٹھیں، اگر جماعت کی طرف سے دین کے اصول کی کوئی واضح تشریح بھی ہو جائے تو معاملہ صاف ہو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی چاہا اس نے کسی چیز کو اصول اور پھر جب چاہا تو "اسلام کے اصولوں سے غیر متصادم" کا فتویٰ لگا کر اسی اصول کو حکمت عملی کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ آہ! اصول اسلام کی اس بے دردی سے پائمالی۔ جنگ آزادی میں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کو لات اور منات کہا گیا ہے، مگر بعد میں یہی چیز اصل الاصول بن گئی، عورت کی امارت۔ اور حکومت کو ہر حال میں اسلام سے متصادم کہا گیا، پھر یہی چیز وقت کا اہم ترین جہاد قرار پایا،

انتخابی جدوجہد کو خلافِ شریعت کہا گیا، پھر یہی مشغلہ روزگار بن گیا، مقصد کے حصول کے لئے ذرائع کی تقدیس ہر حال میں قائم رکھنے پر زور دیا گیا مگر پھر اس راہ کی ہر گری پڑی چیز کو گلے سے لگا کر رفیق جادۂ منزل بنایا گیا، اور اب مسئلہ ملکیت زمین میں گو (اسے عارضی کہا گیا) ایک ایسا موقف اختیار کیا گیا جسکی مخالفت خود عمر بھر کا شیوہ بنا رہا تھا۔ کالتی نقضت غزلھا من بعد قوۃ انکاثا معلوم نہیں جماعت کے عمائدین اس نئے اجتہاد اور حکمتِ عملی کی کیا توجیہہ کریں، تاویل جو بھی ہو مگر یہ نہیں ہونی چاہیئے کہ فلاں فلاں جماعتوں نے بھی ایسا کیا اور فلاں بزرگ نے بھی ایسا کہا ہے۔ اگر ایک چیز کا برائی ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے وزن میں اس بات سے کمی نہیں آسکتی کہ اور لوگ بھی ایسا کرتے ہیں، ایسی بات تو جرائم کی تاریخ میں بھی کسی نے نہیں کہی کہ میں اگرچہ مجرم ہوں مگر یہ تو ایک ایسا جرم ہے کہ ع درشہر شما روز کنند۔ اور نہ کسی عدالت نے مجرم کے اس موقف کو قابلِ تسلیم قرار دیا ہے۔ تعدیل صحابہ، اور دیگر علمی وفقہی مسائل اور اب لاہوری مرزائیوں کے بارہ میں جماعت کا یہی عذر گناہ سامنے آچکا ہے۔ مگر غلط بات غلط ہے خواہ اس کا کہنے والا کتنا بڑا آدمی کیوں نہ ہو یہ تو ایک ضمنی بات تھی، اب رہا ملکیت شخصی کو سلب کرنا یا اسے محدود کرنا۔

★

تو جہاں تک اصل مسئلہ انفرادی اور شخصی ملکیت کا تعلق ہے، خواہ املاک منقولہ ہوں یا غیر منقولہ ہوں اسلام نے اسے انسان کا فطری حق بنایا ہے، نہ تو اسکی تحدید کی جاسکتی ہے اور نہ عصر حاضر کے لادینی اقتصادی نظاموں کے علمبردار اس میں قطع برید کر سکتے ہیں، قرآن کریم نے آیت اولم یروا انا خلقنا لھم مما عملت ایدینا انعاماً فھم لھا مالکون۔ میں انسان کی شخصی ملکیت پر مہر ثبت کر دی ہے اور قرآن کی بیشمار آیتیں اس جملہ فھم لھا مالکون (پس وہ اس کے مالک ہیں) کی تائید کرتی ہیں۔ جو لوگ ان الارض للہ۔ (زمین اللہ کی ہے) قسم کی آیات کو آگے پیچھے سے کاٹ کر اپنے مدعی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، وہاں متصلاً اللہ نے خود یورثھا من یشاء (وہ جسے چاہے زمین کا وارث بنا دے) یا اس کے ہم معنی الفاظ میں انفرادی ملکیت بیان کرکے ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا ہے۔ قل اللھم مٰلک الملک کیساتھ تنزع الملک ممن تشاء بھی ہے اور والذین یکنزون الذھب والفضۃ کیساتھ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ کی قید انسان کی انفرادی مالکیت کا اعلان کر رہی ہے، پھر وہ اسے اپنی ملکیت میں ہر جائز تصرف کرنے اور اسے اپنی ملکیت سے منتقل کرنے کا حق بھی دیتا ہے۔ چنانچہ بیع، شراء، ہبہ، تملیک، اعتاق، تدبیر، کتابت، اجارہ، اعارہ، مزارعۃ، وقف، رہن، قرض، صدقہ، وصیت، میراث وغیرہ اس تصرف

کے شواہد عدل ہیں ۔ اسی طرح وہ کسی دوسرے مسلمان کے مال و دولت میں ناجائز دست اندازی سے بچنے کو ایمان کی اوّلین علامت قرار دیتا ہے ۔ ظلم و تعدّی ، چوری ، ڈاکہ ، خیانت ، غصب ، لوٹ کھسوٹ ، جبر و استحصال کو حرام قرار دیکر اسلام انسان کے شخصی ملکیّت ہی کا تحفظ کرنا چاہتا ہے ۔ وہ یکساں طور پر سرمایہ دار اور غریب دونوں کو ولاتأکلوا اموالکم بینکم بالباطل (ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ) سے مخاطب کرتا ہے ۔ الا لایحلّ مالُ امرئٍ الّا بطیب نفسٍ منہ ۔ الحدیث (خبردار کسی ایک کا مال دوسرے کو بغیر اسکی مرضی کے حلال نہیں ۔)

---★---

پس جو لوگ سوشلزم کو تمام معاشی بربادیوں کا مداوا سمجھتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ اللہ کے بھیجے ہوئے عادلانہ نظام اسلام کے تمام اصول و فروع کو تہس نہس کرنا چاہتے ہیں ، بلکہ وہ لوٹ کھسوٹ اور انسان کے تمام حقوق کی پائمالی و بربادی کا ایک ایسا کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جس میں نہ صرف غریب اپنے رہے سہے سکھ اور چین سے محروم ہو جائے بلکہ پوری قوم چند خونخوار درندوں کی جماعت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہے ، اسلام کے مذکورہ تمام اصول کو ایک طرف رکھ کر ایک لمحہ کیلئے فرض کرلیں کہ سوشلزم آجاتا ہے اور وہ پوری قوم کو حق ملکیّت سے محروم کر کے اللہ کی دی ہوئی تمام دولت اور وسائل معاش کو ایک پارٹی کے حوالے کر دیتا ہے ، تو کیا وہ پارٹی انسانیت کو اُس کے تمام حقوق دلا دے گی ، اور کیا وہ پارٹی موجودہ معاشرہ ہی سے ابھر کر سامنے آئی ہوگی یا آسمان سے فرشتوں کی شکل میں اترے گی ۔ لیکن اگر اسکی اٹھان اس معاشرہ سے ہو جسکا مشت نمونہ خروار ۳۰۳ بدعنوان افسروں کی شکل میں سامنے آچکا ہے اور اس کامل دعقداُس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں ہو جو فائل کی سطح پر بڑے بڑے پراجیکٹ کھڑے کر کے پھر اسے نذر سیلاب بھی کر دیتی ہے ، اور اس طرح کروڑوں روپے ہضم کر کے فائل داخل دفتر کر دیتی ہے —— تو خدارا سوچیئے کہ ایسے لوگوں کا لایا ہوا سوشلزم یا کوئی بھی معاشی نظام انسان کے مال و جان اور اس کے حقوق میں مساوات قائم رکھ سکے گا —— ؟ ہرگز نہیں ۔ سوشلزم کی بنیاد تاریخ کی مادی تعبیر پر ہے جس میں نہ خوف خدا کی گنجائش ہے ، نہ محاسبۂ آخرت کی ، اور نہ کسی کو تنقید اور نصیحت کی ۔ اس کے مقابلہ میں اسلام ہے جو ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرتا ہے جو ہر لمحہ اور ہر عمل میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے ، آخرت کا محاسبہ اس کے دل میں رچا بسا ہوتا ہے ، ہر فرد کو دوسرے پر ظلم و غصب اور ہر برائی سے روکنے کا پورا حق ہے ، اور وہ امیر کو بھی چاہیے تو تلوار سے درست کر سکتا ہے ، وہ اگر اسلامی قلمرو کے دوسرے سرے پر کسی کتے

کے بھوک وپیاس سے مرجانے کی خبر سنتا ہے تو اللہ کے سامنے جواب دہی کے تصور سے تڑپنے لگتا ہے وہ ہر انسان کی بھوک وپیاس کو اپنی حاجت سمجھتا ہے اور جذبۂ ایثار سے خود فقیر رہ کر دوسروں کو اپنی متاع کا مالک بنا دیتا ہے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے معاشی مسائل کی بنیاد مساوات پر نہیں بلکہ مواسات پر رکھی، وہ معاشی ناہمواری کو جبر سے نہیں بلکہ ایمان اور یقین کی بیداری سے حل کرنا چاہتا ہے، اسلام نے ایسا معاشرہ قائم کیا خلافتِ راشدہ اسکی واضح مثال ہے، دوسری طرف سوشلسٹوں کے طور طریقے تھے، اور جبر وظلم کی اساس پر ایک ایسی عمارت اٹھائی گئی جو نصف صدی میں دم توڑتی نظر آنے لگی ہے: تاریخ کی اس مادی تعبیر پر تازہ چانٹا حال ہی میں روس کے سیکرٹری جنرل برزنیف نے یہ کہہ کر رسید کیا کہ روس میں سوشلسٹ نظام عملاً ناکام ہوچکا ہے۔ اور اسطرح فشهد شاهد من اهلها۔ کا ایک نمونہ سامنے آگیا۔ الغرض ہمارے پاس معاشی اور معاشرتی یگانگت کیلئے اسلام جیسا نسخۂ کیمیا موجود ہے، مگر افسوس اور صد افسوس کہ نہ تو ہم نے اسے سمجھا نہ پرکھا اور نہ کبھی آزمایا ومن لم یذق لم یدر۔

ع چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

★

ہماری اس بے علمی اور حقیقت سے بے خبری سے موجودہ دور کے ابن الوقت سیاستدانوں نے خوب فائدہ اٹھایا بیچارے عوام اسے اپنی ساری بربادیوں کا تریاق سمجھ کر ان کے پیچھے دوڑنے لگے اور اس حقیقت سے غافل ہوگئے کہ چور اپنی کمین گاہ تک پہنچا کر رہی سہی پونجی سے بھی ہمیں محروم کر دے گا۔ بات ناشائستہ سی ہے مگر مثال خوب چسپاں رہے گی کہ ہمارے علاقہ میں بچے کا ختنہ کراتے وقت عموماً بچے کو ادھر ادھر کی بھول بھلیوں میں بہلایا جاتا ہے اور ختنہ کا عین موقعہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں وہ دیکھو سونے کی چڑیا اڑ رہی ہے اور ابھی تیرے قدموں میں ہے۔ بچہ شوق سے نگاہ اٹھاتا ہے اور ادھر اپنے جسم کے ایک حصہ سے محروم۔ تو ہمارے ہاں سوشلزم کی مثال اُسی "سونے کی چڑیا" کی سی ہے جس سے عیار لیڈر خوب خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

★

علمی حلقوں کو اس خبر سے بڑا صدمہ ہوگا کہ حضرت مولانا محمد انوری لائلپوری ۲۲ جنوری کو صبح سات بجے انتقال فرما گئے مولانا مرحوم کی عمر تقریباً ستر برس تھی۔ حضرت مولانا رائے پوری سے خلافت

پائی اور حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سے تلمذ اور صحبت و خدمت کی خاص نسبت حاصل تھی۔ عمر بھر علم اور دین کی خدمت و اشاعت میں کوشاں رہے، ۱۹۴۷ء میں لائلپور آکر ایک دینی مدرسہ قائم کیا اور بڑی بے نفسی اور خاموشی سے تبلیغ و تعلیم میں مصروف رہے، حق تعالیٰ مولانا مرحوم کو درجات عالیہ اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ رحمہ اللہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

★

اب تک کئی سیاسی جماعتوں کے انتخابی منشور سامنے آچکے ہیں مگر جمعیۃ العلماء اسلام نے یکم جنوری سے بہت قبل جو اسلامی منشور مرتب کیا اور جس جامع انداز سے ملک کے تعلیمی، اقتصادی معاشرتی اور انتظامی مسائل کو اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں سمویا ہے، اس کی داد نہ دینا ستم ظریفی ہوگی یہ علماء کی طرف سے اپنی قسم کی پہلی جامع اور مؤثر کوشش ہے، جس کی تحسین پوری فراخدلی سے کرنی چاہیئے، پیش نظر منشور کا قصہ بعض جماعتوں سے جمعیۃ کے مشروط معاہدہ سے قطعی طور پر علیحدہ مسئلہ ہے۔ جمعیۃ کے بعض معاہدوں یا پالیسیوں سے از روئے اخلاص اختلاف کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کسی کی صوابدید اسے مذکورہ معاملہ میں شرح صدر نہ ہونے دے۔ تاہم یہ بات بالکل اٹل ہے کہ ایسا منشور نہ تو کیمونسٹ نواز جماعتوں کا ہو سکتا ہے اور نہ کوئی سوشلسٹ ذہن اسے ایک لمحہ کیلئے برداشت کر سکتا ہے۔ اگر کسی جماعت اور پارٹی کا لائحہ عمل اس کے منشور سے واضح ہو سکتا ہے، تو جمعیۃ کا منشور ان تمام الزامات کا جواب ہے جو جمعیۃ پر سوشلسٹ ہونے کے لگائے جارہے ہیں۔ صاف بات تو یہی ہے کہ اکابر علماء حق پورے انصاف سے ایک دوسرے کی لغزشوں پر گرفت کرتے ہوئے بھی اتحاد و اتفاق کی کوئی راہ نکالیں کہ اسی میں دین کا فائدہ اور اسی میں قوم کی نجات ہے، ورنہ باہمی اختلاف اور باہمی الزام اور جواب الزام سے فائدہ بے دین اور گمراہ جماعتوں ہی کو پہنچے گا، افسوس روم جل رہا ہے مگر نیرو بانسری بجانے میں مشغول ہے۔ کاش! باہمی اختلاف کے ہولناک نتائج پر ہمارے تمام اکابر علماء حق کی نظر پڑ جائے اور وہ کسی متفقہ طریق کار اور لائحہ عمل پر یکجا ہو سکیں، محمد قاسم نانوتویؒ کے جانشینوں پر آج پوری قوم کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں پھر کیا وہ اپنی باطنی فراست سے نہیں دیکھتے کہ محمد قاسمؒ سمیت محمود الحسن دیوبندیؒ شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے تمام اکابر کی سعید روحیں اپنی روحانی اولاد کے افتراق و انتشار سے کتنی بے چین ہیں۔!

★

حیدرآباد پر کیا گذری، مسلمان مسلمانوں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئے، جل گئے اور لٹ گئے، اس سے پہلے ڈھاکہ میں ملکی اور غیر ملکی کے نام پر یہی کچھ ہوا۔ ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید۔ پاکستان جس نام پر بنا تھا اس کے لئے مہاجرین نے گھر بار اور عزت و عصمت لٹائی اور انصار نے سب کچھ نثار کر دیا، مگر بائیس سال میں وہ چیز سامنے تو کیا آتی پس پردہ ڈال دی گئی، نتیجۃً وہی ہوا کہ پاکستان غالکم بدہن ریت کا تودہ ثابت ہونے لگا، اگر دعوٰی اور عمل میں تضاد نہ ہوتا اور قول میں سچائی ہوتی تو پاکستان اسلام کا ایک عظیم قلعہ ثابت ہوتا۔ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ مگر اب تو اسکی عمارت "علی شفا جرف ھار" (کھائی کے گرتے ہوئے کنارے پر) دکھائی دیتی ہے۔ کروڑوں مسلمانوں نے ملک و وطن کو خیر باد کہا، ادھر کی ہجرت کی اب بنگال انہیں ٹکنے نہیں دیتا۔ سندھ انہیں مار رہا ہے، سرحد پر پختونوں کا دعوٰی ہے۔ پنجاب پہلے سے گنجان ہے تو لیلائے پاکستان پر لٹ مرنے والوں کا ٹھکانہ کیا ہوگا۔ کچھ اب تک اس کی پاداش میں احمد آباد اور گجرات میں جل رہے ہیں۔ اور جو ادھر آئے اب علاقائی قومی اور لسانی عفریت کی نذر ہو رہے ہیں۔ قرآن نے تو اتحاد اور یگانگت کا ایک ہی نسخہ تجویز کیا تھا کہ وہ ہیں اسلام اور دین کے علائق، مگر وہ رسّی تو اپنے ہاتھوں سے کٹتی چلی گئی، اب روئے زمین کی کوئی طاقت کوئی مادی سہارا کوئی خوشنما اقتصادی پروگرام اور کوئی دلکش علاقائی اور قومی نعرہ اسکی شیرازہ بندی نہیں کر سکتا۔ قرآن نے اپنے رسول کو خطاب کرتے ہوئے اس حقیقت کیطرف اشارہ کیا لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم۔ کہ اگر تو دنیا کا ہر مادی وسیلہ، منصوبہ اور نعرہ کام میں لگا دیتا، تب بھی انہیں یکجا نہ کر سکتا یہ تو صرف اللہ نے انہیں (دین اور اسلام) کی رسّی سے باہم جکڑ دیا ہے ۔ اب جب رسول کے بس کی بات نہ تھی کہ دنیا اور اس کے سارے وسائل لیکر بھی اپنی امت کو یکجا کر دیتے جب تک اس کا ذریعہ اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے دین کو نہ بناتے تو موجودہ دور کے علاقائی، اقتصادی اور سیاسی نعرہ بازیوں کا نتیجہ موجودہ ہولناک مثالوں کے سوا اور کیا ظاہر ہو سکتا ہے۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

۲۲/ ذی قعدہ

اذکروا موتاکم بالخیر

دارالعلوم کے ایک مخلص خادم کی وفات

۲۴ جنوری بروز ہفتہ دارالعلوم کے ایک نہایت مخلص اور ہمدرد رکن شوریٰ جناب الحاج خان محمد اعظم خان خٹک رئیس اکوڑہ خٹک کا انتقال ہوا، مدت سے کینسر کی تکلیف تھی، دارالعلوم کے تاسیس سے لیکر اب تک آپ نے اپنے والد بزرگوار جناب خان اعلیٰ محمد زمان خان خٹک مرحوم کی طرح پوری جانفشانی اور تندہی سے دارالعلوم کی ترقی و استحکام میں حصہ لیا۔ حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے ساتھ غایۃ درجہ کا نیازمندانہ اور خادمانہ تعلق رہا اور کسی حال میں دارالعلوم کا ساتھ نہ چھوڑا۔ تعمیرات کی نگرانی چندہ کی فراہمی الغرض ہر مرحلہ پر پیش پیش رہتے، اس لحاظ سے موصوف کی جدائی دارالعلوم کے پورے حلقہ اور حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کے لئے ذاتی صدمہ ہے۔ مرحوم کی عمر ۱۰ سال تھی، نہایت ملنسار خوش خلق اور قومی و ملی خدمت کے جذبات سے معمور انسان تھے۔ تحریک پاکستان میں اپنے علاقہ میں اہم کردار ادا کیا۔ جنگ کشمیر کا موقعہ ہو یا جنگ ستمبر کا، مہاجرین کی آبادکاری کا سوال ہو یا علاقہ کی تعلیمی اور طبی ضروریات اور بلدیہ کی نظامت، ہر موقع پر بساط سے بڑھ چڑھ کر خدمات بجالائے۔ تقسیم سے قبل آنریری مجسٹریٹ رہے، پھر امیر محمد خان مرحوم کے زمانہ میں صوبائی ایڈوائزری کونسل کے رکن نامزد ہوئے۔ مسلم لیگ کی عاملہ کے ممبر بھی رہے اور ریفرنڈم میں بھی اہم حصہ لیا ۱۹۵۰ء میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے پچھلے کئی سال سے قومی و ملی خدمات کا زیادہ تر حصہ دارالعلوم کے بناؤ سنوار میں لگایا، دنیا سے جاتے جاتے اپنے پڑوس میں ایک شاندار مسجد تعمیر کروائی شدید بیماری کی وجہ سے دن بھر اس کے کام کی نگرانی خود کرتے رہے۔ دارالعلوم کے شعبہ تعلیم القرآن کو نہ صرف زمین وقف کی بلکہ تعمیر کے وسائل اور نگرانی کا کام بھی خود انجام دیا۔ اپنے والد بزرگوار مرحوم خان محمد زمان خان خٹک کے نقش قدم پر چلنے والے اور ان کی کئی خوبیوں کے وارث کی جدائی پر آج نہ صرف دارالعلوم بلکہ پورا علاقہ سوگوار ہے۔ اللہ تعالیٰ حسنات کو قبول اور خامیوں سے درگذر فرماوے۔

مقبولیت کا کچھ اندازہ جنازہ سے ظاہر ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ نماز عصر کے بعد اپنے والد مرحوم کے پہلو میں جگہ پائی۔ رحمہ اللہ علیہ۔

ادارۂ الحق اور دارالعلوم تمام خاندان کیساتھ اس غم میں شریک ہے اور سب سے تعزیت کرتا ہے۔

(ادارہ)

★

ضبط و ترتیب: ادارۂ الحق

حج کی اہمیت اور فضیلت

جذبۂ عشق و عبادت کی تسکین

(خطبۂ جمعۃ المبارک ۱۵ ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ)

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) قال اللہ تعالیٰ وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تابعوا بین الحج والعمرۃ فانھما ینفیان الفقر والذنوب۔

وقال النبی علیہ السلام من ملک زادًا و راحلۃً۔ (الحدیث)

محترم بزرگو! اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اوّل ــــ کلمۂ شہادت ہے پھر نماز، پھر روزہ پھر زکوٰۃ ہے۔ پھر حج۔ حج اللہ کے بیت کی زیارت کا قصد کرنا ہے۔ اوقات مخصوصہ میں افعالِ خاصہ کے ساتھ شوال ذی قعدہ اور ذی الحجہ اشہر حج کہلاتے ہیں احرام باندھنے کے لئے ان تین ماہ سے تقدیم مناسب نہیں، ان ایام میں بقصد حج احرام باندھ کر بیت اللہ جانا طواف زیارت کرنا، سعی کرنا، عرفات جانا، مزدلفہ اور منیٰ میں ٹھہرنا، رمی کرنا اور کئی دیگر مناسک کی ادائیگی جو کتابوں میں مذکور ہیں۔ حج سے عبارت ہیں۔

عرفات کیلئے نویں ذی الحجہ کی اور بطور افضلیت طواف زیارت کیلئے دسویں دن مخصوص ہے۔ تو حج کے اوقات بھی مخصوص ہیں اور امکنہ یعنی مقامات بھی مخصوص ہیں اور ادائیگی کی کیفیّت اور حاجی کی حالت اور شان بھی مخصوص ہے۔

اس وقت تفصیل کا وقت نہیں، اتنا سمجھنا چاہیئے کہ جن و انس کی پیدائش کا مقصد عبادت ہے

اور عبادت کیلئے عبادت گاہ پہلے سے چاہیئے۔ جیسا کہ ہم تجارت کا ارادہ کرلیں تو اس کے لئے منڈی دوکان اور بازار دیکھتے ہیں تب تجارت ہوتی ہے، مدرسہ ہے سبق پڑھنے کے لئے تو اس کے لئے جگہ سامان کتابیں اور مکان ضروری ہے، عمارت ہوگی تو طالب العلم کو اس میں سبق پڑھایا جائے گا۔ تو اللہ نے جن وانس کی پیدائش سے پہلے ہی اس کے لئے عبادت گاہ بنائی۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعلمین۔ اس کی نظر رحمت اور توجہ، تخلیق ارضی سے پہلے اس مبارک اور مقدس خطہ پر ہوئی اور اس مقام پر خداوند قدوس کی تجلیات کے نزول کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور جس طرح کہ آپ دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کی ساری مملکت اسکی ملک ہوتی ہے مگر ایک اس کا خاص قیام گاہ اور محل ہوتا ہے جسے خاص شان اور مقام حاصل ہوتا ہے۔ خداوند کریم مکان سے منزہ ہے وہ تو امکنہ کا خالق ہے، مکین نہیں نہ اسے کسی مکان و زمان کی حاجت ہے۔ مگر اس کی تجلیات کا نزول اس مکان پر لگاتار ہوتا رہتا ہے۔ جسے ہم کعبہ مکرمہ کہتے ہیں اور یہی شرف باعث ہے جسکی وجہ سے مسلمان جہاں بھی ہو سفر میں یا حضر میں نماز پڑھتے وقت قبلہ رخ ہوگا تب نماز صحیح ہوگی یا قبلہ کی تحری کرے گا تب قبول ہوگی۔ الغرض خانہ کعبہ محل نزول تجلیات باری تعالی ہے، اور مرکز جمال ہے اور مخلوقات میں اس تجلی کی نظیر ایسی ہے کہ آئینہ سورج کے سامنے کردو تو سورج جو کئی کروڑ میل دور اور آئینہ سے کئی کروڑ گنا بڑا ہے مگر آئینہ میں بوجہ شفاف ہونے کے سورج کی شعاع اور عکس آجاتا ہے۔ اس تجلی شمس کی وجہ سے آئینہ پر اثرات سورج مرتب ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً سورج گرہن ہو تو بعض لوگ آئینہ سورج کے سامنے رکھ کر اس کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں، اس سے بھی کئی لوگ اندھے ہوئے ہیں، جبکہ اس وقت اسکی شعاع اور روشنی مضمحل ہوتی ہے اور آتشی شیشہ میں تو سورج کی حرارت اور گرمی بھی جو خاصہ شمس ہے آجاتی ہے۔ تو گو سورج کا قرص اور جسم بھی اپنی جگہ پر ہے، اور نہ اسکی شعاع اور حرارت کو آئینہ نے احاطہ کرلیا ہے بلکہ وہ بھی اپنی جگہ پر ہیں، مگر اس کا انعکاس ہوگیا تو شیشہ روشنی کا مرکز بن گیا۔ تو مظہر تجلی ہونے کی بھی ایسی ہی صورت ہوتی ہے۔ ہمارے حضرۃ مولانا محمد قاسم رحمہ اللہ نے ایک نکتہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مظہر تجلی ہیں اور خانۂ کعبہ عکس مظہر تجلی ہے۔ بہرحال اللہ نے تخلیق آدم و جن اور تخلیق ارض سے پہلے بیت اللہ کے خطہ کو پیدا فرمایا اور ان الارض دحیت من تحتھا۔ اس کے نیچے سے ساری دنیا پھیلائی گئی اور جس طرح تمام حیوانی اور جسمانی عناصر کی اصل زمین ہے۔ اسی طرح ہماری زمین کا مرکزی نقطہ یہی خانہ کعبہ بنادیا گیا، پھر اسے تمام فیوض و برکات کا محور قرار دیا گیا اور اللہ نے اسے سارے

انسانوں کے قیام کا ذریعہ کہا جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس۔ (الآیہ) پھر امن و امان اور ساری خیر و برکت کا سرچشمہ بھی اسے بنا دیا۔ اذ جعلنا البیت مثابۃً للناس وامناً۔ اور جب ہم نے بنایا بیت اللہ کو خیر و برکت اور امن کی جگہ جس کی طرف انسان بار بار لوٹتے رہتے ہیں۔

روایات میں ہے کہ خیمہ کی شکل میں ایک موتی کو اتار کر یہاں رکھا گیا اور فرشتے نامعلوم مدت تک اس کا طواف کرتے رہے، پھر جنات آئے پھر انسان کا دور آیا، سب وہاں اللہ کی عبادت کرتے رہے۔ پھر اسکی تعمیر طوفانِ نوح کے بعد حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام جیسے جلیل القدر نے اپنی ہاتھوں سے فرمائی۔ واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

پھر نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ۳۵ برس کی عمر میں خود اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ پتھر ڈھوئے حجر اسود کو اپنے ہاتھ مبارک سے اُس مقام پر رکھا جہاں اب موجود ہے۔ اور طواف و حج وغیرہ کے موقع پر اسے بار بار چوما اور استلام فرمایا۔ خانہ کعبہ کے طواف فرمائے۔ ملتزم کے ساتھ چمٹ گئے، اور روئے، گڑگڑائے، آخر دم تک خانہ کعبہ کی طرف نمازوں میں رخ فرمایا۔ خداوند کریم نے بیت اللہ کو جسے انبیاء نے اپنے سجدوں سے آباد رکھا "اپنے گھر" کا خطاب دیکر اسکی نسبت اپنی طرف فرما دی اور اس طرح اسکی عظمت اور احترام پر دائمی مہر لگا دی ——

بھائیو! مسلمان تو عاشقِ خدا ہے والذین آمنوا اشد حباً للہ۔ کی بنا پر سب سے زیادہ عشق رکھے گا۔ اور عاشق اپنی ساری کمائی جان و مال محبوب حقیقی پر بھیج دیتا ہے، سب کچھ اُس کی راہ میں لٹاتا ہے، نہ چین نہ راحت کی فکر نہ گھر بار کی اُسے ہر وقت محبوب کی تلاش رہتی ہے۔ کو بہ کو اور صحرا بہ صحرا حیران و سرگردان پھرتا رہتا ہے کہ کسی طرح محبوب سے ملاقات ہو جائے، دنیا کے عشاق کو دیکھئے کہ کھانا پینا، فیشن، صفائی، آرام، لباس اور تعیش سب کچھ چھوڑ کر دیوانے نکل جاتے ہیں۔ تو جو لوگ اللہ تعالیٰ سے جو کہ محبوب حقیقی ہے معشوق حقیقی ہے عشق رکھیں انہیں صبر کیسے ہو سکتا ہے وہ ضرور حج اور عمرے کی شکل میں اس کے گھر کی زیارت کریں گے۔ محبوب سے ملاقات نہ ہو تو اس کی جلوہ گاہ سے تسکین ہو جاتی ہے، دیوانہ وار طواف کرتے ہیں کہ کسی گوشہ میں تو محبوب کی جھلک نظر آجائے، بے چینی بڑھ جائے تو شہر مکہ چھوڑ کر منیٰ، مزدلفہ اور عرفات کی خاک چھانتے ہیں، اور مارے مارے پھرتے ہیں کہ شاید یہاں جلوۂ یار نظر آجائے۔ یہاں تک کہ عشق کے سوز و گداز میں اپنے آپ کو قربانی کے لئے منیٰ کے میدان میں پیش کر دیتا ہے۔

مگر مالک حقیقی کا حکم ہوا کہ تم اپنے آپ کو قربان گاہ پر قربانی کیلئے پیش نہ کرو، بلکہ حیوان کی قربانی تمہاری قربانی کے بدلہ میں ہمیں منظور ہے۔ حضور کا ارشاد ہے :

تابعوا بین الحج والعمرۃ فانہما ینفیان الفقر والذنوب۔ لبشارۃ ہے کہ حج کی وجہ سے فقر اور گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

اولاً تو عاشق کو محبوب کی تلاش میں مادی نقصان اور مال کی پرواہ ہی نہیں ہوتی، لیکن اگر کسی کو فکر ہو کہ سارا مال خرچ ہو جائے گا تو فقیر بن جاؤں گا۔ تو حضورؐ نے ایسے لوگوں کو خوشخبری دی کہ بظاہر تو عمر بھر کی کمائی حج میں لگ گئی مگر درحقیقت حج کی خاصیت یہ ہے کہ یہ تو پرانی غربت اور فقر کو بھی کاٹ دیتی ہے اور یہ تو تجربہ شدہ چیز ہے کہ گو ہر جگہ مال خرچ کرنے سے فقر آتا ہے مگر حج کے بعد رزق کی فراخی بڑھ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ حج گناہوں کو بھی ختم کر دیتا ہے، حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے حج کیا اور ہر قسم کے رفث، فسوق و فجور، اور اس کے دواعی اور فحش باتوں سے بھی بچتا رہا، نماز باجماعت قضا نہ کی، ہاتھ پاؤں نظر قابو میں رکھے اور خاص طور سے باہمی جنگ و جدال اور گالی گلوچ سے بھی بچتا رہے اور خصوصیت سے جنگ و جدال سے بچے ولا جدال فی الحج کہہ کر اس لئے منع کیا گیا کہ سفر کی صعوبت اور ساتھیوں کا ایک دوسرے سے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے جھگڑوں کی نوبت بہت آتی ہے۔ یہ ہمارے طلبہ اور حجاج حضرات کے جھگڑے ایک جیسے ہوتے ہیں کہ معمولی سی ناگوار بات پر آمادۂ جنگ ہو جاتے ہیں ورنہ وہاں تو زر، زن، زمین ہو جنگ کی بنیاد ہوتے ہیں، کا جھگڑا نہیں ہوتا بلکہ کام کاج میں ساتھیوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے، تو اللہ نے روک دیا کہ لڑائی جھگڑا بالکل نہ کرو نہ کسی کو اذیت پہنچاؤ۔ اگر کوئی بات ایسی پیدا بھی ہو جائے تو صبر سے کام لو اور وہاں قدم قدم پر اللہ ایسے مواقع سے آزمائش کراتا ہے، ہم جب جدہ اترے تو شام کا وقت تھا تو پہلے تو جگہ نئی اور نا معلوم پھر کسی سے دریافت کرتے تو وہ درشتی اور سخت کلامی سے پیش آتا تو گویا ہر مرحلہ پر ضبط کا دامن تھامنا ہوگا، ایسے وقت میں عاشق کا کام یہ ہے کہ تکالیف اور برے بھلے کی پرواہ نہ کرے پھر باشندگان حرمین سے تو اس لئے بھی شکوہ نہ کیا جائے کیونکہ حضرت آدمؑ سے لیکر اب تک لاکھوں اور ہزاروں حاجیوں سے ہر وقت انہیں واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ان کے لئے حاجیوں کا آنا کوئی نئی بات نہیں۔

بہر حال جب ہم مجازی عشق میں برے بھلے کی پرواہ نہیں کرتے تو عشق حقیقی میں کیا مجال کہ اُف تک کیا جائے۔ اسے تو جتنی تکلیف پہنچے اتنی ہی خوشی محسوس کرے گا، اللہ کی راہ میں حرف

شکایت زبان پر نہ لائے گا سختی اور درشتی سے کسی کو جواب نہ دے گا۔ حرمین الشریفین کے مجاورین اور پڑوسیوں سے ہر حالت میں اعزاز و اکرام سے پیش آنا چاہیئے، اور کسی بات میں نکتہ چینی نہ کی جائے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے لکھا ہے کہ نواب چھتاری ایک دفعہ مدینہ طیبہ گئے، زبان سے ایک دفعہ ناگواری سے نکلا کہ مدینہ طیبہ کا دہی تو ترش ہے، رات خواب میں حضور اقدسؐ کی زیارت ہوئی اور ڈانٹا کہ مدینہ کا دہی ترش ہے تو جاؤ مدینہ سے نکل جاؤ، بیدار ہوئے تو پریشان تھے اور کہا کہ غرق ہوا، اب اس کا کیا علاج ہوگا۔ کسی بزرگ سے ذکر کیا تو کہا کہ حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کے مزار پر جاکر روؤ اور معافی مانگ لو۔ گیا، رو دیا، استغفار کیا، رات خواب میں حضرت حمزہؓ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا کہ عقلمندی یہ ہے کہ ابھی نکل جاؤ، ورنہ ایمان خطرہ میں ہے، گویا حکم ہوا کہ یہاں نوابی اور امیری کا ٹھاٹھ نہیں چلے گا۔ اگر حکم کی تعمیل میں پس و پیش کیا تو ایمان سلب ہو جائے گا ـــــ تو یہ منزل عشق ہے۔ اس کا احترام اور ادب قائم رکھنا بہت ضروری امر ہے۔ یاد رہے کہ وہاں اکڑ اور بے ادبی سے کام نہیں چل سکتا۔

الغرض حضورؐ نے ان تمام آداب کو ملحوظ رکھنے والے کو بشارت دی کہ حج مبرور کی جزا جنت ہی ہوگی، کوئی دوسری چیز نہیں۔ مقبول کی علامت یہ ہے کہ حج میں کوئی خلاف شرع بات نہ کرے اور حج کے بعد اس کی زندگی کے اعمال حج سے قبل کی زندگی سے بہتر ہو جائیں۔ حج سے قبل جو معاصی اور اعمال سیئہ ہوتے تھے اب حج کے بعد اعمال صالح کرتا رہے اور اعمال سیئہ کو ترک کرے تو حج مقبول و مبرور ہے۔ اور اگر پہلے سے زیادہ دنیا کو رغبت اور انہماک ہے نیکی کی طرف جذبہ کم ہے اور بدی سے اجتناب نہیں تو سمجھیئے کہ حج مقبول اسے نصیب نہیں ہوا، اور ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا کہ حج مقبول پانے والا حاجی جب گھر لوٹتا ہے تو معاصی اور گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے کہ بچہ ابھی پیدا ہوا ہو۔ رجع کیوم ولدتہ امہ۔ بچہ پیدائش کے وقت گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اس طرح حج مقبول تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

حج مقبول کیلئے عالم باعمل کی رہنمائی اور رفاقت بہت بہتر ہے تاکہ مسائل بھی معلوم ہو سکیں۔ اور نہ جماعت فوت ہو نہ مناسک میں نقصان آئے، ایک اور حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بیت اللہ شریف دلہن کی پالکی کی طرح سجا سجایا ہوگا، اور جن لوگوں نے حج کیا ہو، اس کا طواف کیا ہو، حجر اسود کو چوما ہو وہ اس کے دامن کو پکڑ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ یہ حصہ جنت میں چلا جائے تو جتنے حجاج بھی اس کے ساتھ چمٹے ہوں گے، وہ بھی ساتھ چلے جائیں گے۔ حضورؐ نے

اُس شخص کے بارہ میں جس پر حج فرض ہوا، اور اس نے ادائیگی میں کوتاہی کی، فرمایا کہ مجھے اس کے بارہ میں کوئی پرواہ نہیں کہ یہودی مرجائے یا نصرانی ہو کر مرجائے۔ جس آیت میں فرضیت حج کا ذکر ہے اس میں بھی اس فریضہ کی عدم ادائیگی پر "ومن کفر" کا لفظ مرتب کیا ہے کہ جس نے حج نہ کیا گویا اس نے کفر اختیار کیا۔ عنوان اور تعبیر بہت سخت ہے جیسے کافر حج نہیں کرتے اس شخص نے بھی اُن کی طرح حج نہ کیا۔ پھر اس سے زیادہ سخت اور جانکاہ اعلان ہے فان اللہ غنی عن العالمین۔ کہ بے شک ایسے لوگوں سے اللہ بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ اور جنہیں عشق و محبت ہو ان لوگوں کو اس سزا کی تلخی اور شدّت کا احساس ہو سکتا ہے۔ عاشق کیلئے محبوب کی بے نیازی ایسی سزا ہے جس سے بڑھ کر کوئی مصیبت اور تکلیف نہیں ہو سکتی، اس لئے حاجی امداد اللہؒ فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک آخرت کی بدترین سزا اور عذاب وہ ہے جسے اس آیت میں بیان کیا گیا ہے کہ لا یکلمھم اللہ ولا ینظر الیھم۔ پس نہ تو اللہ ایسے لوگوں سے بات کرے گا اور نہ نظر شفقت سے نوازے گا ۔۔۔ کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون۔ یہ لوگ قیامت کے دن خدا کے دیدار سے محروم و محجوب رہیں گے، یہ لوگ اللہ کو نہ دیکھ سکیں گے۔

تو یہ تکلیف و مصیبت جہنم میں داخل ہونے سے زیادہ ہو گی۔ حج کی ادائیگی میں کوتاہی اور غفلت کا وبال بھی بہت سخت ہے۔ حج مقبول کے لئے اتنی بات ضروری ہے کہ دیگر عبادات کی طرح حج و عمرہ بھی خالص اللہ کی رضا کی خاطر ہو۔ نام و نمود اور نمائش یا سیر و سیاحت اس کا مقصد نہ ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے ؎ اغنیاء و امراء سیر و سیاحت اور اوسط درجہ کے لوگ تجارت اور مالی منافع کیلئے، علماء قرّاء نام و نمود اور فقراء بھیک مانگنے کے لئے بھی حج کیا کریں گے۔

تو حج محض رضائے مولیٰ اور ادائے فرض کی خاطر ہونا چاہئے، اگر نیّت صحیح ہے تو ایسے لوگ حج کی قبولیت کے لئے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہوں۔ علی بن موفقؒ فرماتے ہیں کہ میں نے عرفہ کی رات خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے ایک دوسرے سے بات چیت کر رہے ہیں ایک نے پوچھا حجاج تو بہت ہیں، کن کا حج قبول ہوا۔؟ دوسرے نے جواب دیا کہ صرف چھ آدمیوں کا قبول ہوا۔ بیدار ہوئے تو رونے لگے کہ میں تو یقیناً ان چھ میں نہیں ہوں گا۔ اس لئے میرا حج بھی مقبول نہ ہوا ہو گا۔ دوسری رات سوئے تو پھر وہی فرشتے اور ان کی گفتگو خواب میں دیکھی اور فرشتے نے دوسرے کو کہا کہ ان ۶ افراد کی وجہ سے اللہ نے سب حاجیوں کا حج قبول کر دیا تو خوش ہوئے

اور اجتماعی عبادات نماز باجماعت وغیرہ میں یہی فائدہ ہوتا ہے کہ بعض افراد کی برکت سے قصوروار لوگوں کا ٹوٹا پھوٹا عمل بھی قبول ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حج کا ارادہ کرنے والے بعض مخلصین کے اعمال کی وجہ سے حجاج کا حج قبول ہو جاتا ہے۔ وہ حج تک نہ بھی پہنچ سکے ہوں ان کے اخلاص جذبۂ شوق اور کسی اور عمل کا وزن سب پر بھاری ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ نے حج کیا رات کو خواب دیکھا، فرشتے نے کہا کہ صرف ایک آدمی کا حج قبول ہوا اور اسکی وجہ سے سب حاجیوں کا حج بھی قبول ہوا مگر وہ شخص خود حج میں شریک نہیں ہوا۔ وہ شخص بیدار ہوا اور حج سے فراغت کے بعد اس کی ٹوہ میں لگا رہا، خواب میں نشان اور علامت معلوم ہوئی تھی، تلاش کرتے کرتے بالآخر اس کے پاس پہنچے وہ شہر سے باہر کھیتی باڑی کر رہا تھا۔ اُس کو واقعہ سنایا اور حالات اس سے دریافت کئے کہ تم حج پر بھی نہیں گئے اور حاجیوں کا حج تمہاری وجہ سے قبول ہوا۔ اُس نے کہا کہ میں نے کچھ پونجی اکٹھی کی تھی سفر حج کے لئے۔ ایک دن میرے پڑوسی نے اپنے گھر میں گوشت پکایا تھا، میرے بچے اس سے ترکاری مانگنے کیلئے گئے، اس نے کہا یہ تمہارے لئے حرام ہے، پھر بطور شکوہ اس سے ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ میرے بچے بھوک سے تڑپ رہے تھے تو میں نے ان کے لئے مردار کبوتر پکایا، تو میں تو مضطر تھا اور تم غنی ہو، اس لئے نہ دیا کہ تمہارے لئے وہ حرام تھا۔ میں نے وہ پونجی اس کو دیدی کہ اسے تجارت میں لگا دو، خود اگلے سال حج پر جانے کی کوشش کروں گا۔ اسی طرح جو لوگ ہر سال اخلاص اور محبت سے کوشش کرتے ہیں مگر حکومت کی بے جا پابندیوں کی وجہ سے اُن کا نام قرعہ میں نہیں نکلتا، انہیں بھی اللہ کی طرف حج کے برابر اجر و ثواب کی امید رکھنی چاہیئے۔ فضیلت و ثواب۔ تو مل ہی جاتا ہے۔ گو قانونی حج سے ذمہ فارغ نہیں ہوتا۔ وہ تو جب بھی موقعہ میسر ہوا، لازمی ہوگا، مگر اس وقت جو صدمہ اور تکالیف ناکامی کی وجہ سے ہوئی، شاید اسکی وجہ سے اوروں کا حج بھی قبول ہو چکا ہو۔ اب ایک بات اور سن لیں کہ حاجی جب سفر حج پر روانہ ہو تو اس سے مل کر دعا کی درخواست کرنی چاہیئے۔ شہرت اور نام و نمود کے لئے ہنگامہ نہیں ہونا چاہیئے واپسی میں بھی جب تک حاجی گھر بار کی آلائشوں سے پاک ہو دعا لینی چاہیئے کیونکہ وہ واپسی میں گناہ سے پاک ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مصافحہ کریں، سلام کریں کہ اس نے حجر اسود اور بیت اللہ کو مس کیا ہے۔ اس وقت وہ معصوم عن المعاصی ہے، اللہ کے گھر سے آیا ہوا مہمان ہے ــــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بار بار حج مقبول و مبرور نصیب فرماوے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔　"

حضرت مولانا خالد محمود صاحب ایم اے
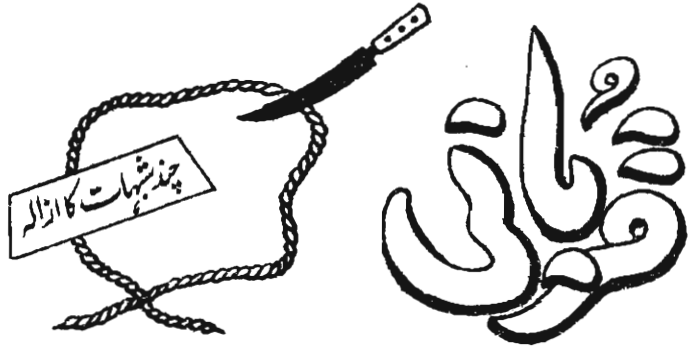
قربانی کے دنوں میں گوشت کا ضرورت سے زائد ہونا اور اس فراوانی کے پیش نظر اسے داخلِ اسراف سمجھنا ایک لغو مغالطہ ہے۔

اوّلاً یہ کہ جب شرع پاک سے ایک امر ثابت ہو تو اسے عقلی اعتراضات اور ذہنی خدشات کا مورد بنانا ایک منافقانہ چال ہے۔ اسلام میں عید الاضحیٰ کے موقعہ پر قربانی کرنا ہر صاحب نصاب مسلمان کے ذمہ واجب ہے جو وسعت کے باوجود نہ کرے اسے کوئی حق نہیں کہ مسلمانوں کی عید گاہ کے قریب بھٹکے، اصل سوال قلت وکثرت کا نہیں بلکہ اطاعت شریعت اور امتثال امر کا ہے۔ حضورؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ایک سو اونٹ قربان کئے، ان کو یہ خیال نہ ہوا کہ یہ اسراف ہو رہا ہے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

ثانیاً یہ کہ اگر قربانی کا گوشت درست طریقے سے غربا میں تقسیم ہو تو سب کے حصے میں شاید دو دو بوٹیاں نہ آئیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ پہلے یہ امر معلوم ہو کہ کتنے لوگ اپنے اقتصادی حالات کے پیش نظر روزانہ گوشت کی خوراک برداشت کر سکتے ہیں۔

اس باب میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شہری آبادی زیادہ سے زیادہ دسواں حصہ روزانہ گوشت کھانے پر قدرت رکھتی ہے، پس ہر شہر میں یومیہ جتنے بکرے ذبح کئے جاتے ہیں ان سے دس گنا زیادہ اگر عید قربان کے موقعہ پر ذبح کئے جائیں تو اس میں اسراف کا قطعاً احتمال تک پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یہ امر معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارے ملک میں اقتصادی حالت کے پیش نظر کتنی آبادی کے ذمہ قربانی کرنا لازم آتا ہے۔ اس میں اگر امعانِ نظر سے کام لیا جائے تو غالباً دسویں حصے سے زائد آبادی اسکی مکلف

نہیں ٹھہرے گی، اور اگر ہو بھی تو شریعت مقدسہ نے قربانی میں تین دنوں کی گنجائش دی ہے۔ پس اگر تیس فیصدی مسلمانوں پر بھی قربانی کرنا واجب ہو تو تب بھی تین دن کی وسعت میں سارے گوشت کا مصرف بجا ہوگا، اور اسراف سے محفوظ ہوگا۔ یہ تفصیل صرف شہری آبادی سے متعلق ہے اگر دیہاتی آبادی کو بھی ملحوظ رکھا جائے، جہاں کی صرف بیس فیصد پبلک گوشت کی خوراک برداشت کر سکتی ہے اور اسکے ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رکھ لیا جائے کہ موجودہ دور کے ذرائع نقل و حرکت کی بنا پر قربانی کا گوشت دیہات کے غرباء ناداروں پر بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے، تو اس حقیقت کے باور کرنے سے چارہ نہیں رہتا کہ قربانی کا گوشت اگر درست اور مناسب طریقہ سے تقسیم ہو سکے تو سب کے حصہ میں دو دو بوٹیاں بھی آویں اسی کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیئے، کہ دیہاتی آبادی شہری آبادی کی نسبت کہیں زیادہ ہے اور قربانی کے دنوں میں وہ یومیہ ذبیحے بھی دکانوں پر نہیں آتے جو دوسرے دنوں میں ہوا کرتے ہیں۔ پس ان تمام حقائق و امکانات کو پیش نظر رکھنے سے یہ حقیقت بے غبار ہو جاتی ہے کہ ایام نحر میں گوشت کی فراوانی کو داخل اسراف اور ضرورت سے زائد سمجھنا ایک ڈھکوسلہ ہے جس میں کوئی معقول وجہ نہیں پائی جاتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پھر ان دنوں میں حکیموں اور ڈاکٹروں کی گرم بازاری کیوں ہوتی ہے۔ تو اس کا جواب گوشت کی غلط تقسیم اور بہت سے ناداروں اور غریبوں کو گوشت کی طلب پر بے نیل و مرام واپس لوٹانا ہے۔ پس اس کا حل گوشت کی درست تقسیم میں ہے نہ کہ قربانی بند کرا دینے میں۔

ثالثاً یہ کہ اگر قربانی کو مسلمانوں کی ضرورت سے زائد بھی مان لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ کیسے نکل آیا۔ کہ قربانی کو بند کر دیا جائے۔ جبکہ قربانی کو سلیقہ کے ساتھ ذخیرہ کر کے سارے سال استعمال کیا جا سکتا ہے اور محتاجوں کی ضرورت بھی اس کے ساتھ سارے سال کے کسی وقت پر پوری کی جا سکتی ہے۔

سید دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تو گوشت ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مگر اسکی وجہ لوگوں کی تنگی اور شدید قحط کا وجود تھا۔ پھر بعد میں آپ نے اجازت دیدی تھی کہ قربانی کا گوشت خود بھی کھاؤ، دوسروں کو بھی کھلاؤ اور ذخیرہ بھی کرو۔ (مشکوٰۃ وفی معناہ فی البخاری جلد ۲ ص ۸۳۵)

قربانی کو اگر مان بھی لیا جائے تب بھی اس کی قیمت کسی قومی فنڈ میں ادا کرنا زیادہ مناسب ہے اللہ تعالیٰ کو اس کا گوشت پوست نہیں پہنچتا، اس کے حضور میں تو تقویٰ مطلوب ہے۔

الجواب :- جب قربانی کا حکم اسلام میں ثابت ہے اور اس پر جو ثواب اور انعام مرتب کیا گیا ہے۔ یہاں تک ہے کہ ایک ایک بال اور ایک ایک کھر بلکہ ایک ایک سینگ کے بدلے باوجود یکہ یہ چیزیں قابل استعمال بھی نہیں، ایک ایک نیکی کے ثواب کا وعدہ دیا گیا ہے۔ اور عید قربان کے دن

سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک "اہراق دم" ہے تو کون عقلمند ہوگا کہ اتنے ثواب کی امید کسی دوسرے صدقۂ مالی سے جس کے بارے میں شریعت کا کوئی حکم بھی موجود نہیں ہے لگائے رکھے کیا کسی حدیث میں عید قربان کے دنوں میں زیادہ خیرات کرنے کو یا صدقات مالیہ میں توسیع کو موجب اجر مزید کہا گیا ہے۔ جب ایسا نہیں اور ہرگز نہیں تو قربانی کا بدل تلاش کرنا کونسی عقلمندی ہے۔ فقہاء کرام لکھتے ہیں:

شراء الاضحیۃ لعشرۃ دراھم خیر من التصدق بالف درھم

دس درہم سے قربانی کا جانور خریدنا ایک ہزار درہم فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔

(جوہرہ نیرہ ج ۲ ص ۲۵۱ فتاوی عالمگیری ج ۵ ص ۱۵۱)

کیونکہ ثواب اہراق دم میں ہے نہ کہ انفاق مال میں ـــــ باقی رہا قومی فنڈوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا تو اسکی آسان صورت یہ ہے کہ وہ تمام روپیہ جو حرام کاموں میں صرف ہو رہا ہے، مصرف بیجا سے بچا لیا جائے۔ ایک طرف بدی کا سدّباب ہو جائے گا، تو دوسری طرف وہ قومی فنڈ بھی مضبوط ہو جائیں گے۔ یہ کیا لغو حرکت ہے۔ کہ جب قومی فنڈ کو ضرورت درپیش آئے تو اسکی مشق ستم اسلام کی معصوم عبادات ہی بنیں اور سینماؤں وغیرہ کے ذریعہ جو دولت بے بہا ضائع کی جارہی ہے، اسکی طرف نگاہ ہی نہ اٹھے، یہ ٹھیک ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جانوروں کا گوشت پوست نہیں پہنچتا۔ اسے صرف تقویٰ درکار ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ قربانی کرنے میں للہیت اور خلوص ہونا چاہیئے۔ ریاکاری اور جاہلیت اولیٰ کا دکھاوا نہ ہو، اصل مقصود تقویٰ ہے۔ لیکن اس کے حصول کا جو طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے۔ وہ اسی طریقہ سے حاصل ہوگا، چنانچہ قربانی کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا: ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب۔ پس شریعت پر بتائے ہوئے طریقہ سے جانور ذبح کرنے کے بغیر اس صفت تقویٰ کو ممکن الوصول جاننا بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۳۳۸ھ میں فرمایا تھا کہ یہ چاند، مریخ اور دیگر ستارے آسمان پر نہیں ہیں (بلکہ آسمان کے نیچے ہیں) اس کے متعلق تقریر محفوظ تھی مگر اس وقت ذہن میں نہیں، اس تقریر کو پچاس ۵۰ سال ہو گئے ہیں ـــــ

(اقتباس از مکتوب مولانا محمد انوری مدظلہٗ لائل پور۔ بنام سمیع الحق۔)

میجر جنرل فضل مقیم خان صاحب
واہ آرڈیننس فیکٹری

" نئی نسل کدھر " اس کا آسان سا جواب تو یہ ہے کہ " جدھر ہم اسے لئے جا رہے ہیں " لیکن انسانی مسائل کے حل اگر اتنے آسان ہوتے تو انہیں مسائل سے تعبیر ہی کیوں کیا جاتا۔

سب سے پہلے تو یہ متعین کر لینا ضروری ہے کہ " نئی نسل کدھر " کا مطلب کیا ہے۔ یہ سوال کب اور کن وجوہات کی بناء پر اٹھا اور آجکل کیوں زور پکڑتا جا رہا ہے۔ دراصل " نئی نسل کدھر " میں دو سوال مضمر ہیں اولاً یہ کہ ہمارے نوجوان کس راستے پر جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کے لئے کونسا راستہ موزوں ہے۔ یہ سوال ہمارے معاشرہ میں کچھ نئے سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اتنے نئے بھی نہیں۔ تاریخی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں سوال اس وقت اٹھے، جب مسلمان ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف اپنی جنگ کے آخری معرکے میں شکست کھانے کے بعد انگریزوں کا بنایا ہوا " نظام تعلیم " اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور اس تعلیم کے نتیجے میں فرنگی تہذیب کے اثرات مسلم سوسائٹی میں ظاہر ہونے لگے۔ اس رجحان کے خلاف اسی وقت سے اعتراضات کئے جانے لگے۔ یہیں سے پہلی مرتبہ ہمارے معاشرے میں " نئی نسل کدھر " کا سوال اٹھا اور اس کا حل پیش کرنے کی روایات بھی قائم ہونے لگیں۔

اس برصغیر کے مسلمانوں کی جدید تاریخ میں جو ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد سے شروع ہوتی ہے۔ دو عظیم شخصیتوں نے عملی مگر بالکل مختلف راستے دکھائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مقصد دونوں کا ایک ہی تھا۔ اور وہ یہ کہ " بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے کون سے طریقے پورے کر سکتے ہیں "۔ — ایک تھے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور دوسرے سر سید احمد خان اور دونوں اتفاق سے ایک ہی استاد

یعنی مولوی سلوک علی صاحب کے شاگرد تھے۔ ایک طرف مولانا محمد قاسم نانوتوی ؒ نے جنہیں دارالعلوم دیوبند کا اصلی بانی کہنا چاہیئے روائتی دینی تعلیم پر زور دیا اور جو چیز اسلام کی روح کے خلاف نظر آئی اسے بالکل نکال باہر کیا چنانچہ انگریزی تعلیم غرضیکہ ہر انگریزی چیز دین کے خلاف قرار پائی اور چند سال میں دیوبند بذات خود ایک تحریک بن گئی۔ دوسری طرف سر سید احمد خان علی گڑھ تحریک کے بانی اور روح رواں نے محمڈن انگلو اورنٹیل کالج کی بنیاد رکھی جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنی۔ سر سید نے انگریز کا بنایا ہوا طریقۂ تعلیم اپنایا۔ لیکن یہ تعلیم اسلامی ماحول کے اندر رائج کی۔ کالج کا نشان، یونیفارم بی اے تک دینیات اور اردو کی لازمی تعلیم، نماز کی پابندی وغیرہ سب اسی مقصد کے لئے تھے ___ ان دو مختلف تحریکوں نے اس برصغیر کے مسلمانوں پر اور مسلم معاشرہ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ چنانچہ بعد کی تمام تعلیمی تحریکیں انہیں سے متاثر ہوئیں۔ لیکن دیوبند اور علی گڑھ کے وجود میں آتے ہی یہ سوال کہ "نئی نسل کدھر جارہی ہے" یا کونسا راستہ اختیار کررہی ہے، اٹھنا شروع ہوگیا۔ دیوبند سے ہمارے معاشرہ کی اقدار اور نظریات کو خطرہ نہیں تھا۔ دیوبند تو انہیں روایتی انداز ہی میں زندہ رکھنے کی کوشش میں تھا۔ دوسرے دینی معاملات کو زیر بحث لانا یا ان پر تنقید کرنا کوئی عقلمندی کی بات بھی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس کے برعکس بدیشی اقدار اور فرنگی تہذیب مسلم معاشرہ کی اقدار اور نظریات سے بظاہر متصادم نظر آتے تھے۔ اس لئے یہ سوال خاص طور پر ان ہی جوانوں کی بابت پوچھا جاتا تھا جو انگریزی تعلیم حاصل کررہے تھے۔ اور اس کے نتیجہ میں انگریزی تہذیب کو بھی آہستہ آہستہ اپنا رہے تھے، لیکن یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ تنقید نئی تعلیم حاصل کرنے کے خلاف نہ تھی، کیونکہ ان میں بہت سے مضامین تو وہی تھے جو ہمارے نصاب میں پہلے بھی شامل تھے۔ مخالفت البتہ نئے طریقۂ تعلیم اور مغربی طرز کے تمدن کی تھی۔ تنقید کرنے والوں میں سب سے زور دار اور ہر دلعزیز آواز اکبر الہ آبادی کی تھی۔ شاید اس لئے کہ انہوں نے تنقید کا ذریعہ اپنی شاعری کو بنایا جس میں طنز و مزاح سے پورا پورا کام لیا گیا۔ مثال کے طور پر ان کا ایک شعر کتنا زور دار اور ہمہ گیر ہے ؎

یوں قتل پہ بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   صد حیف کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبر اور ان کے ہمنواؤں نے تنقید کی ایسی روایت قائم کی جنہوں نے "نئی نسل کدھر جارہی ہے" تو کہا لیکن خود کوئی متبادل راہ نہ دکھائی۔ تعمیری تنقید کی روایت کا سہرا مولانا حالی کے سر بندھا جسے علامہ اقبال نے مکمل و مثبت بنایا۔ ان دونوں عظیم شخصیتوں اور ان کے دوسرے ہم خیالوں نے جہاں یہ سوال اٹھایا کہ ہمارے نوجوان کدھر جارہے ہیں وہاں یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ کون سا راستہ ان کیلئے موزوں ہے۔ علامہ اقبال نے تو ایک مخصوص فلسفۂ تعلیم و تربیت بھی پیش کیا ___ اس کے باوجود ہماری بدقسمتی تھی کہ ان نقادوں نے راستہ کا تعین تو کیا لیکن اپنے وقت کے نوجوانوں سے اس پر عمل نہ کرا سکے، کیونکہ انگریز حکمران سوائے اپنے فلسفۂ تعلیم کے کسی اور طریقۂ تعلیم کو ماننے کیلئے تیار نہیں تھا ؛

حافظ نذر احمد صاحب ایم اے معتمد مجلس تعلیمات پاکستان

ہمارے سرکاری نظامِ تعلیم میں قرآنِ مجید

ہمارے سرکاری نظامِ تعلیم میں قرآنِ مجید کا کتنا حصّہ ہے۔؟ حافظ صاحب نے نہایت تحقیق اور کاوش سے اس سوال کا جواب دیا ہے۔ دین اور مبادیات دین سے ہمارے نظامِ تعلیم میں جتنی بے اعتنائی ہو رہی ہے اس کا نتیجہ نئی پود کی بے راہ روی، فکری انتشار، اور بیرونی نظریات کی رو میں بہہ جانے اور پورے معاشرہ کی بربادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اگر گندم سے گندم اور جَو سے جَو برآمد ہوتا ہے۔ تو اس سے زیادہ واضح حقیقت یہ ہے کہ موجودہ سرکاری نظام اور طرزِ تعلیم ہی موجودہ تمام خرابیوں کو جنم دے رہا ہے اگر اسکی کوکھ سے سرشلزم نہ نکلتا تو موجب حسرت ہوتا۔ کچھ توقعات نئی تعلیمی پالیسی سے وابستہ ہوگئی تھیں، مگر اس کے ساتھ سرد مہری اور لطائف و حیل کا جو سلسلہ چل نکلا ہے اس نے امید کو مایوسی میں بدل دیا ہے۔ "ادارہ"

اس نظامِ تعلیم اور اس کے انتظامات پر ہم قدرے تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں، چونکہ طلبا کی اکثریت یہیں زیرِ تدریس ہے۔

(الف) ناظرہ کلام اللہ | ابتدائی سکولوں کی تیسری جماعت میں قرآنی قاعدہ پڑھایا جاتا ہے۔ چوتھی اور پانچویں جماعتوں میں باقی کلامِ پاک کی ناظرہ خوانی داخلِ نصاب کی گئی ہے۔ (جبکہ مساجد اور مکاتب میں یہ کام صرف سال دو سال میں مکمل ہو جاتا ہے۔) لیکن یہ سب کچھ محکمہ تعلیم کے گشتی مراسلوں اور کاغذی سکیموں کی حد تک ہے۔ عملاً شاید ہزار میں سے دو چار سکولوں میں ہی مکمل ناظرہ خوانی کا انتظام ہوگا۔ اس لئے کہ نہ کہیں ناظرہ پڑھانے کیلئے تربیت یافتہ حفاظ و قراء کا انتظام ہوا ہے، نہ آئندہ تربیت کیلئے ہی کوئی انتظام کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی نازک کام دوسرے مضامین کی طرح تربیت یافتہ اساتذہ کے بغیر ممکن نہیں۔

(ب) حفظ قرآن | ابتدائی مدارس کی جماعت چہارم و پنجم میں آخری دس مختصر صورتیں اور ہائی سکول کی جماعت ششم میں صرف نو آیات حفظ کرنا نصاب کا حصہ ہے۔ گویا کلام اللہ کی تقریباً ساڑھے چھ ہزار

آیات میں سے تیس یا بتیس آیات اوّل سے آخر تک یاد کرانا نصاب میں شامل ہے۔

(ج) ترجمہ کلام اللہ | ابتدائی مدارس کی کسی جماعت میں کسی ایک آیت کا ترجمہ بھی شاملِ نصاب نہیں۔ وسطانی (مڈل کلاسز) میں آخری پارہ کی دس مختصر سورتوں کا اور سورۃ البقرہ کی چار آیات کا ترجمہ نصاب میں شامل ہے۔ جماعت نہم دہم میں اگر کوئی طالب علم اختیاری اسلامیات کا پرچہ لے تو ۲۲ آخری مختصر سورتوں کا ترجمہ پڑھ لیتا ہے۔ ورنہ صرف پندرہ سورتوں کا ترجمہ رہ جاتا ہے، جن میں سے دس کا ترجمہ وہ پہلے ہی چھٹی ساتویں جماعتوں میں پڑھ چکا ہے۔

نصاب سازی میں منصوبہ بندی کی یہ کیفیت دانشوروں کے لئے خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔

(د) تفسیر کلام اللہ | انٹرمیڈیٹ میں اگر کوئی طالب علم اسلامیات کا مضمون اختیار کرے تو نصف سورۂ بقرہ کی تفسیر پڑھ سکتا ہے۔ وہ بھی صرف آرٹس کا طالب علم، کیونکہ سائنس کے طلبا اسلامیات پڑھ ہی نہیں سکتے۔ نصف سورۂ بقرہ بھی لاہور بورڈ میں ہے، پشاور بورڈ، حیدرآباد اور کراچی بورڈ میں صرف سات رکوع کی تفسیر شاملِ نصاب ہے۔ بی اے میں اگر کوئی طالب علم اسلامیات کا مضمون اختیار کرے تو پشاور یونیورسٹی میں سورۃ بنی اسرائیل اور آخری پارہ کا آخری ربع شاملِ نصاب ہے۔ پنجاب یونیورسٹی میں سورۂ محمدؐ، سورۃ فتح اور الحجرات یا ان کی جگہ سورۃ النساء داخلِ نصاب ہے۔ کراچی یونیورسٹی اور سندھ یونیورسٹی میں آخری پارہ کی آخری مختصر ۲۲ سورتوں کی تفسیر نصاب کا حصہ ہیں۔

یونیورسٹی کے آخری مرحلہ پر (جو طلبہ ایم اے علوم اسلامی کرنا چاہیں) ان کے نصاب میں تاریخ ادب تفسیر اور اصولِ تفسیر کے علاوہ ترجمہ و تفسیرِ قرآن کا نصاب مندرجہ ذیل ہے:

پنجاب یونیورسٹی میں	سورۃ المائدہ تا سورۃ التوبہ۔
کراچی یونیورسٹی میں	سورۃ البقرہ اور سورۃ بنی اسرائیل۔
پشاور یونیورسٹی میں	سورۃ البقرہ کے صرف نو رکوع

(جو وہ ایف اے میں پڑھ چکا ہوتا ہے۔)

سندھ یونیورسٹی میں ـــــ کسی آیت کا ترجمہ و تفسیر بھی شاملِ نصاب نہیں۔

فنی اور پیشہ وارانہ تعلیم میں قرآن کا حصہ | عمومی نظامِ تعلیم کے علاوہ پاکستان میں فنی، تربیتی اور پیشہ وارانہ تعلیم کے متعدد سکول۔ کالج۔ انسٹیٹیوٹ۔ اکیڈمیاں بورڈ اور یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ صرف مغربی پاکستان کے اعداد و شمار یہ ہیں:

ایک ایک انجینئرنگ یونیورسٹی، زرعی یونیورسٹی، اور ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ۔ میڈیکل کالج، ہومیوپیتھک

کالج اور طبیہ کالج ۱۹

انجینئرنگ کالج	۳	کمرشل انسٹیٹیوٹس	۲۴
پولی ٹیکنیک انسٹیٹیوٹس	۲۲	ووکیشنل سنٹرز	۳۲
لار کالج	۸	کامرس کالج	۸
ٹیچرز ٹریننگ کالج	۹		

ان کے علاوہ زرعی کالج، فارسیٹ کالج، امراضِ دندان کا کالج، طب حیوانات کالج، نیشنل کالج آف آرٹس جسمانی تربیت کے کالج، افسران انتظامیہ کی تربیتی اکیڈیمیاں، اور بری، بحری فضائی افواج کے تربیتی ادارے بھی موجود ہیں۔

مندرجہ بالا (۱۳۱) اداروں میں زیر تدریس اور زیر تربیت طلباء کی مجموعی تعداد پچاس ہزار کے قریب ہے۔ لیکن سوائے ایک انجینئرنگ یونیورسٹی کے (جہاں سورۃ فاتحہ کی تفسیر شامل نصاب ہے) اور کہیں کلام اللہ کا کوئی حصہ کسی صورت میں نصاب میں شامل نہیں۔

یورپین ٹائپ سکولوں میں تعلیم قرآن آخر میں ہم یورپین (اردو ذریعہ تعلیم والے) سکولوں میں تعلیم قرآن کے انتظامات کے بارہ میں چند کلمات لکھنا چاہتے ہیں۔

بدیشی آقاؤں کے رخصت ہو جانے پر، اور ایک آزاد ریاست کے معرض وجود میں آجانے کے بعد، غیر ملکی انداز کی ان مخصوص درسگاہوں کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ ملک کا محب وطن حساس طبقہ اس صورت حال پر مسلسل احتجاج کر رہا ہے۔ لیکن جس شدت سے احتجاج ہو رہا ہے، اسی تیزی ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس کا اندازہ مندرجہ ذیل گوشواروں سے ہو سکتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں

	سکول	طلبا	اساتذہ
پشاور ریجن	۳	۴۹۰	۲۷
لاہور "	۱۷	۶۳۰۳	۲۹۱
حیدر آباد "	۵	۱۳۸۴	۶۵
کوئٹہ "	۳	۱۰۴۱	۵۰
	۲۸	۹۲۱۸	۴۳۳

سنہ ۱۹۶۱ء میں

	سکول	طلباء	اساتذہ
پشاور ریجن	۱۰	۳۱۴۳	۱۷۱
لاہور 〃	۶۳	۷۴۷۲	۳۷۰
حیدرآباد 〃	۶	۳۱۰۱	۱۲۶
کوئٹہ 〃	۵	۱۶۴۶	۶۹
	۸۴	۱۵۳۶۲	۷۳۶

سنہ ۱۹۶۶ء میں

	سکول	طلباء	اساتذہ
پشاور ریجن	۱۵	۵۷۷۰	۳۰۰
راولپنڈی 〃	۲۲	۷۵۹۵	۲۶۸
لاہور 〃	۲۶	۹۳۵۵	۴۴۵
حیدرآباد 〃	۱۶	۸۳۸۱	۲۵۸
کوئٹہ 〃	۳	۱۷۵۷	۶۹
کراچی 〃	۱۰	۴۹۷۲	۲۱۹
	۹۲	۳۷۸۳۰	۱۵۵۹

گویا دس سال میں سکولوں کی تعداد ۲۸ سے ۹۲ ہوگئی۔ اور طلباء ۹۲۱۸ سے ۳۷۸۳۰ تک پہنچ گئے۔
ان یورپین ٹائپ سکولوں میں اکثریت مسیحی مشنری اداروں کی ہے، یہاں کلام اللہ کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بے بسی ملاحظہ ہو کہ ان سکولوں کو تدریس اسلامیات کے لئے ایک ایک کمرہ بنانے کا خرچہ سرکاری خزانہ سے دیا گیا ہے اور معلم اسلامیات کی تنخواہ بھی۔ اب ان سکولوں میں یہ کمرے کس کام آرہے ہیں اور اساتذہ اسلامیات عملاً کس حد تک اسلامیات پڑھا رہے ہیں، یہاں اسکی تفصیل کا مقام نہیں۔

میٹرک کی تیاری کرانے والے سکولوں میں اگر نصاب کی حد تک بدرجہ مجبوری کوئی انتظام ہو بھی تو جونیئر کیمرج اور سینئر کیمرج کی تیاری کرانے والے اداروں کے نصاب میں کلام اللہ کا ایک لفظ بھی داخل نہیں۔

(بشکریہ سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر)

تحریر : علامہ محمد اسد (حال متوطن مراکش)
ترجمہ : محمد معین خان بی اے (عثمانیہ)

اسلام کا مقصد و منہاج

—— قسط دوئم ——

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کاملیت (PERFECTION) کی اصطلاح جن معنی میں یہاں استعمال ہوتی ہے اس کی وضاحت کر دی جائے تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہونے پائے، جہاں تک حیاتیاتی اعتبار سے محدود و محصور نوع انسانی کا معاملہ ہے۔ کاملیت مطلقہ (OBSOLUTE PERFECTION) کے تصور پر کچھ سوچا ہی نہیں جا سکتا، کیوں کہ مطلقیت تو صرف صفات الٰہی کا حق ہے۔ اس لئے جب کبھی انسانی کاملیت (HUMEN PERFECTION) کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ اپنے صحیح نفسیاتی اور اخلاقی معنی کے اعتبار سے محض ایک اضافی اور وہ بھی انفرادی چیز ہوتی ہے۔ ایسی کاملیت سے ہرگز ان تمام اوصاف حمیدہ کا حامل ہونا مراد نہیں ہے، ذہن جن کا تصور کر سکتا ہے اور نہ اس سے مراد خارج سے نئے نئے اوصاف کا اخذ و اکتساب کرنا ہے۔ بلکہ اس سے تو فرد کے پہلے ہی سے موجود اوصاف کا ایسا فروغ مراد ہے جو اس کی خلقی مگر خوابیدہ قوتوں کو ابھار دے۔ مظاہر حیات (LIFE PHENOMENA) قدرتی طور پر متنوع ہونے کے باعث ہر انسان کے پیدائشی اوصاف مختلف ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ فرض کر لینا کہ تمام انسانوں کو ایک ہی جیسی کاملیت حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیے اتنی ہی بعید از عقل بات ہوگی جتنی کہ دوڑ اور بار برداری کے دو نہایت ہی عمدہ اور قوی گھوڑوں کے بارہ میں یہ سمجھ لیا جائے کہ دونوں بالکل ہی ایک جیسے اوصاف کے حامل ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں گھوڑے اپنی اپنی جگہ کامل تو ہو سکتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوں گے۔ نوع انسانی کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ اگر کاملیت کسی مخصوص نمونہ پر معیاری قرار دیدی جاتی ——— جیسا کہ مسیحیت نے تارک الدنیا درویش کے نمونہ پر کاملیت کا معیار قائم کر رکھا ہے ——— تو لوگوں کو اپنے انفرادی فرق و امتیاز سے یا تو دست بردار ہو جانا پڑتا یا اسے متغیر و پامال کر دینا پڑتا۔ اس عمل سے انفرادی تنوع (INDIVIDUAL) کے

اس قانونِ الٰہیہ کی صریح خلاف ورزی ہوتی جو روئے زمین کی ساری حیات پر غالب و مسلط ہے۔ اسی لئے اسلام جو جبر و تشدد کا مذہب نہیں ہے، انسان کو اپنے شخصی اور سماجی وجود کے دائرہ کے اندر بہت وسیع گنجائش عطا کرتا ہے تاکہ مختلف افراد کے نوع بہ نوع اوصاف، طبائع اور نفسیاتی میلانات اپنی اپنی افتاد و منشار کے مطابق ایجابی فروغ کی طرف اپنی اپنی راہیں پیدا کرلیں۔ اس طرح ایک آدمی چاہے تو تارک اللذات بن جائے یا جائز حدود کے اندر اپنے شہوانی ممکنات سے بھرپور لذت حاصل کرے۔ چاہے تو خانہ بدوش بن جائے جو آذوقۂ فردا کے بغیر صحرائے لق و دق میں مارا مارا پھرتا ہے یا دولتمند تاجر جو ہر وقت اپنے مالِ تجارت میں گھرا رہتا ہے۔

غرض یہ کہ انسان جب تک خداوندِ عالم کے نافذ کئے ہوئے قوانین کی صدق و شعور کے ساتھ اطاعت کرتا ہے، اس وقت تک وہ آزاد ہے کہ اپنی زندگی کو اپنی فطرت کی ہدایت کے مطابق جس صورت میں چاہے ڈھال لے۔ اس کا فریضہ یہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو نہایت خوش اسلوبی سے بروئے کار لائے تاکہ اس سے اپنے خالق کے عطا کردہ انعامِ حیات کی کماحقہٗ قدر ہو سکے اور یہ کہ وہ خود اپنی نشو و ترقی کے وسیلہ سے اپنے ہم جنسوں کی روحانی، سماجی اور مادی مساعی میں امداد و اعانت کرے لیکن یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسکی انفرادی زندگی کی صورت گری کسی معیار کی رہینِ منت نہیں ہوا کرتی، بلکہ وہ آزاد ہے کہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے نامحدود جائز ممکنات سے جو ممکنات چاہے اس مقصد کیلئے منتخب کرے۔

اسلام میں اس "حریت فکر" کی بنیاد اس تصوّر میں ملتی ہے کہ انسان کی اصل فطرت بالالتزام صالح ہوتی ہے۔ مسیحیت کا تصوّر یہ ہے کہ انسان گنہگار پیدا ہوتا ہے اور ہندومت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان فی الاصل ذلیل و ناپاک ہوتا ہے، لہٰذا کاملیت کی منزل پر پہنچنے کے لئے وہ تناسخ کے ایک طویل سلسلہ سے افتاں و خیزاں گذرنے پر مجبور ہے۔ لیکن ان دونوں کے برعکس اسلامی تعلیم یہ دعوٰی کرتی ہے کہ انسان پاک ــــ مذکورہ بالا معنوں میں ــــ اور بالقوۃ کامل پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ - کہ ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ اور یہ آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے کہ: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سورہ ۹۵: ۴، ۵) پھر (رفتہ رفتہ) اس (کی حالت) کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔

اس آیت میں اس عقیدہ کا اظہار کیا گیا ہے کہ انسان اصلاً صالح اور پاک ہوتا ہے، مگر خدا کے

ساتھ اسکی بداعتقادی اور اعمال صالح کے فقدان سے اس کی پیدائشی کاملیت غارت ہو جاتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر انسان شعور کے ساتھ خدا کی توحید کا قائل ہو جائے اور خدا کے قوانین کے آگے اپنا سر اطاعت خم کر دے تو وہ اپنی پیدائشی کاملیت کو برقرار رکھ سکتا ہے، یا دوبارہ حاصل کر سکتا ہے۔ پس اسلام کی رو سے بدی نہ تو لابدی ہے اور نہ پیدائشی۔ یہ دراصل اخذ و اکتساب ہے انسان کی متاخر زندگی کا جسکا سبب ان پیدائشی مثبت اوصاف کا بے جا اور بے محل استعمال ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے ہر انسان کو عطا ہوتے ہیں۔ لیکن ہر صورت میں یہ فی نفسہ بالقوۃ کامل ہوتے ہیں، اور انسان کی انفرادی حیات دنیاوی کے دوران ان کا فروغ تام سے بہرہ مند ہونا ممکن ہے۔ ہم یہ مان لیتے ہیں کہ حیات بعد الموت اپنے احساس و ادراک کے یکسر بدلے ہوئے شرائط کے سبب ہمیں بالکل ہی نئے اوصاف و ملکات عطا کرے گی، جن کی بدولت روحِ انسانی کے لئے ترقی مزید کے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن اس معاملہ کا تعلق تو صرف ہماری حیات اخروی سے ہے۔ حیات دنیاوی سے نہیں۔ اسلام پورے وثوق اور قطعیت کیساتھ یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم میں کا ہر فرد آب و گل کی اسی دنیا کے اندر اپنے ان فطری ایجابی خصائص کی نشو و ترقی کی بدولت جن سے ہماری انفرادیتیں متشکل ہوتی ہیں، بھرپور کاملیت سے شادکام ہو سکتا ہے۔

دنیا میں ایک اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو انسان کے لئے اسکی تمام تر حیات دنیاوی سے لطف اندوز ہونے کا ایسا امکان پیدا کرتا ہے کہ اس کی روحانی منزل لمحہ بھر کے لئے بھی اسکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو پاتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ یہ چیز مسیحی تصور سے کس قدر مختلف ہے! مسیحی عقیدہ کی رو سے نوعِ بشر ایک ایسے موروثی گناہ کے بوجھ تلے لڑکھڑا کر گر پڑتی ہے، جو آدم ؑ سے سرزد ہوا تھا۔ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو اپنی ساری زندگی، کم از کم اذعانی نظریہ (DOGMATIC THEORY) کے اعتبار سے، حزن و ملال کی ایک تیرہ و تار گھاٹی نظر آنے لگتی ہے۔ مسیحی عقیدہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یہ زندگی دو مخالف قوتوں کی رزم گاہ ہے۔ ایک بدی کی قوت جس کی نمائندگی شیطان کر رہا ہے اور دوسری نیکی کی قوت جس کی نمائندگی حضرت مسیح علیہ السلام کر رہے ہیں۔ شیطان جسمانی ترغیبات کے ذریعہ ابدی نور کی جانب روح انسانی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ روح حضرت مسیح کی ملکیت ہے اور جسم شیطانی موثرات کی بازی گاہ ہے۔ اس تشریح کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ عالم مادی تمام تر شیطانی اور عالم روح تمام تر ربانی ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو چیز بھی مادی یا مسیحی الٰہیات کی اصطلاح میں "شہوانی" نظر آتی ہے۔ وہ راست نتیجہ

ہے حضرت آدمؑ کی اس لغزش کا جو آپ سے شیطان کا مشورہ قبول کرنے کے باعث سرزد ہوئی تھی۔ لہٰذا حصولِ نجات کے لئے انسان پر لازم ہے کہ وہ اس عالمِ بشریت سے منہ پھیرے اور مستقبل کے عالمِ روحانی سے اپنا دل لگائے جہاں نوعِ بشر کے گناہ کا کفارہ مسیح مصلوب کی قربانی سے ادا ہو جاتا ہے۔

اگر اس عقیدہ کی عملی اتباع نہ بھی کی جائے ـــــ اور نہ کبھی کی گئی ـــــ تب بھی اس قسم کی تعلیم کا وجود ہی ایک ایسے آدمی کے دل میں جو مذہب کی طرف میلان رکھتا ہو، خطا داری کا ایک مستقل احساس پیدا کرنے کا موجب بن جاتا ہے۔ ایک طرف تو ترکِ دنیا کا حکم ناطق ہے، اور دوسری طرف زندہ رہنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا فطری تقاضہ ـــــ ان دونوں کے درمیان اس شخص کا دل ایک گیند کی مانند ادھر سے ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔ ایک ناقابلِ گریز گناہ ـــــ اس لئے کہ وہ وراثت میں آیا ہے ـــــ اور مسیح مصلوب کے اٹھائے ہوئے دکھوں کے ذریعہ اس گناہ کے ـــــ ـــــ پراسرار کفارہ کا تصور ہی انسان کے روحانی اشتیاق اور زندہ رہنے کی جائز تمنا کے درمیان سدِّ سکندری بن جاتا ہے۔

اسلام میں ہمیں ازلی گناہ کے تصور کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ بلکہ ہم تو اس تصور کو عدلِ الٰہی کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں۔ جب اللہ تبارک تعالیٰ بیٹے کو باپ کے اعمال کا ذمہ دار قرار نہیں دیتا تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نوعِ بشر کی لاتعداد نسلوں کو نافرمانی کے ایک ایسے گناہ کا ذمہ دار ٹھہرائے جو ان سے نہیں بلکہ ان کے کسی سلف پیشین سے سرزد ہوا تھا۔ بلاشبہ اس عجیب وغریب مفروضہ کے بارہ میں فلسفیانہ تشریحات تو مرتب کی جا سکتی ہیں لیکن عقلِ سادہ کے نزدیک یہ مفروضہ ہمیشہ اتنا ہی مصنوعی اور بے بنیاد اور غیر اطمینان بخش رہے گا جتنا کہ خود تثلیث کا عقیدہ۔ اسلام میں چونکہ موروثی گناہ کے تصور کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اس لئے یہاں نوعِ بشر کی نجاتِ عام کا بھی کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ یہاں نجات و عذاب بالکلیہ انفرادی چیزیں ہیں۔ ہر مسلمان اپنا آپ نجات دہندہ ہے۔ اس کا دل اپنے اندر روحانی فوز و خسران کے تمام ممکنات سموئے ہوئے ہے۔ آدمی کی شخصیت کے بارہ میں قرآنِ پاک کا ارشاد ہے کہ: لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (سورہ ۲: ۲۸۶) اچھے کام کرے گا تو اسکو ان کا فائدہ ملیگا، برے کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا ـــــ دوسرا ارشاد ہے: لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (سورہ ۳ : : ۳۹) انسان کو وہی ملتا ہے جسکی وہ کوشش کرتا ہے۔

لیکن انسان یہاں زندگی کے اس غمناک پہلو سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا جس کی مسیحیت تشریح

کرتی ہے، وہاں وہ حیات دنیا دی سے وہ مبالغہ آمیز قدر بھی منسوب نہیں کرتا جو جدید مغربی تہذیب منسوب کرتی ہے۔ ایک طرف مسیحیت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حیات دنیا دی ایک مشغلۂ باطل ہے تو دوسری طرف مغرب جدید ــــ مسیحیت ــــ بے باکانہ ــــ زندگی کا اتنا ہی مفتوں ہے جتنا کہ ایک بندۂ شکم اپنی خوراک کا، بندۂ شکم اپنی خوراک کو پیار جاتا ہے، لیکن اس کا احترام نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام حیات دنیا دی کو اطمینان و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسلام زندگی کی پرستش تو نہیں کرتا لیکن اسے ایک رفیع تر حیات کی طرف جانے والے راستہ کی ایک عضویاتی منزل سمجھتا ہے۔ چونکہ یہ زندگی ایک منزل ہے اور وہ بھی ضروری ولابدی اس لئے انسان کو نہ صرف اس سے حقارت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس کی کم قدری کرنے کا بھی اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہمارا اس دنیائے آب و گل میں سے ہو کر گذرنا بھی قدرت کے نظام تقدیر کا ایک ضروری ایجابی جزو ہے۔ اسی لئے حیاتِ انسانی بے انتہا قدر کی حامل ہے۔ لیکن یہ حقیقت فراموش نہ ہونی چاہئے کہ یہ قدر محض ایک قدرِ معاون (INSTRUMENTAL VALUE) ہے۔ اسلام میں مغرب جدید کی مادی رجائیت پسندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو یہ کہتی ہے کہ "میری بادشاہت صرف اسی دنیا کی ہے" اور نہ مسیحی تحقیر حیات کے اس مقولہ کے لئے کوئی جگہ ہے کہ "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے" اسلام کا راستہ ان دونوں کے بین بین ہے۔ قرآن مجید ہمیں اس دعا کی تعلیم دیتا ہے:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ	پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت
فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا	میں بھی نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے
عَذَابَ النَّارِ (سورہ ۲ : ۲۰۱)	محفوظ رکھیو۔

پس دنیا اور اسکی بھلائی کی بھرپور قدر و تحسین ہماری روحانی مساعی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بنتی۔ مادی خوشحالی تو بہرحال ایک پسندیدہ چیز ضرور ہے لیکن یہ فی نفسہٖ کوئی مقصود نہیں ہے۔ ہماری تمام عملی سرگرمیوں کا مقصود و مدعا ایسے شخصی اور سماجی حالات کی تخلیق و پرداشت ہونا چاہئے جو لوگوں کی اخلاقی توانائی کی نشوو ترقی میں ممد و معاون ہو سکے۔ اسلام انسان کو اس کے ہر عمل کی اخلاقی ذمہ داری کے شعور کی راہ سوجھاتا ہے۔ خواہ یہ عمل چھوٹا ہو کہ بڑا۔ انجیل کے اس مشہور و معروف حکم "قیصر کا قیصر کو دیدو اور خدا کا خدا کو دیدو" کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے کیونکہ اسلام زندگی کی اخلاقی اور عمرانیاتی معاشی ضرورتوں کے مابین کسی آویزش کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ہر معاملہ میں صرف ایک ہی انتخاب روا ہو سکتا ہے اور وہ ہے حق و باطل کا انتخاب اور بس ــــ بین بین قسم کی قطعاً کوئی چیز نہیں۔ یہی وجہ

ہے کہ اسلام میں عمل پر اخلاق کے ایک ناگزیر عنصر کی حیثیت سے اس قدر شدید اصرار کیا جاتا ہے۔ ہر مسلمان کو اپنے تئیں ان تمام حادثات کا ذمہ دار گردانا پڑتا ہے۔ جو اس کے گرد و پیش وقوع میں آتے ہیں۔ نیز ہر وقت اور ہر جگہ قیام حق اور انہدام باطل کی سعی و کوشش کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکی تائید قرآن مجید کی حسب ذیل آیت میں ملتی ہے۔

کُنتُمْ خیر امۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔

(مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ (سورہ ۳: ۱۱۰)

یہ ہے اسلام کی اس "جارحانہ فعالیت" (AGGRESSIVE ACTIVISM) اور شہنشاہ پسندی (IMPERIALISM) کا جواز جو اہلِ مغرب کو اسلام میں اسکی ابتدائی فتوحات کی بناء پر نظر آیا کرتی ہے۔ ہم بھی ببانگ دہل کہتے ہیں کہ بیشک اسلام "شہنشاہیت پسند" تھا، لیکن یہ شہنشاہیت پسندی ایسی تھی جسے شوقِ تسلط اور ہوس ملک گیری نے نہیں ابھارا تھا۔ نہ تو معاشی یا قومی خودغرضی ہی سے اس کا کوئی علاقہ تھا۔ نہ دوسری اقوام کے ضیاع و نقصان سے مسلمانوں کی آسائشات میں اضافہ کی طرح ہی سے اس کا کوئی واسطہ تھا، اور نہ کبھی اس کا یہ مقصد رہا کہ غیر مسلموں کو جبر و استبداد کے ذریعہ حلقہ بگوش کیا جائے۔ اس کا تو صرف ایک ہی مقصد تھا ــــ جو آج بھی ہے ــــ کہ انسان کی ممکنہ بہترین روحانی نشو و فروغ کے لئے ایک دنیاوی چوکھٹا تیار کیا جائے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے معرفتِ اخلاق انسان پر خود بخود اخلاقی ذمہ داری عائد کر دیتی ہے۔ لہذا فروغ حق اور انہدام باطل کی تحریک و تشویق کے بغیر حق و باطل کے مابین محض ایک افلاطونی امتیاز قائم کر دینا فی نفسہٖ ایک ایسا عمل ہے جو بدیہی طور پر منافی اخلاق ہے۔ اسلام کی رو سے نظام اخلاق انسان کی اس سعی و کاوش کے ساتھ جیتا اور مرتا ہے جو روئے زمین پر اس نظام کی بالادستی کے قیام و استحکام کے لئے بروئے کار لائی جاتی ہے۔

■

دین اور شعائر دین کا احترام

اس مضمون پر حضرت قاری محمد طیب صاحب کی نایاب تقریر کا اگلا حصہ اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمادیں

قسط دوئم

جناب اختر راھی ۔ ایم اے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ

مسلم مؤرخین میں ابن اسحاق (م ۱۵۱ھ)۔ ابن ہشام (م ۲۱۳ھ یا ۲۱۸ھ) اور فقہاء میں علامہ ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) نے معاہدے کا مکمل متن نقل کیا ہے۔ واقدی (م ۲۰۷ھ) نے کتاب المغازی میں معاہدے کے بعض اجزاء نقل کئے ہیں، لیکن ڈاکٹر حمید اللہ کے الفاظ میں اس دستاویز کی صحیح اہمیت یورپی عیسائی مستشرقین نے محسوس کی ہے۔ گذشتہ صدی ڈیڑھ میں ولہاوزن (WELLHAUSEN) میولر (MULLER) گریم (GRIMME) اسپرنگر (SPRINGER) وینسنک (WENSINCK) کائتانی (CAETANI) اور بول (BUHL) نے اپنی کتابوں میں اس دستاویز کو پیش کیا ہے۔ بعد ازاں عصر حاضر کے مسلمان مورخین اور مفکرین نے اور خصوصاً ڈاکٹر حمید اللہ نے تحقیق و تفحص اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے مختلف متون کا تقابلی مطالعہ کر کے دنیا کے اس پہلے تحریری دستور کو پیش کیا اور اپنی محنت کی داد یورپ تک سے وصول کی۔ جدید دور کے ایک اور مسیحی اہل قلم مجید خدوری[1] نے بھی اپنی مشہور کتاب "اسلامی قانون میں صلح و جنگ" میں پورا متن نقل کیا ہے۔

معاہدہ دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصے میں ولہاوزن کے شمار کے مطابق ۲۳ فقرات ہیں۔

---

[1] مجید خدوری صاحب عراق کے مشہور مسیحی فاضل ہیں جو امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی اور یونیورسٹی آف شکاگو میں پروفیسر رہے۔ بعد ازاں جان ہاپکنز یونیورسٹی میں شعبۂ تحقیق سے منسلک ہو گئے، ان کی یہ کتاب مستشرقانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ "چراغ راہ" اسلامی قانون نمبر جلد دوم میں انہیں "مسلمان مستشرق" لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے۔

ان ۲۳ فقرات (دفعات) میں مہاجرین اور انصار کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا حصہ جو ۲۴ دفعات پر مشتمل ہے، اس میں یہودی قبائل کے حقوق و فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ معاہدے کا مکمل متن درج ذیل ہے۔

۱۔ یہ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے قریش اور اہل یثرب میں سے مومنوں اور مسلمانوں کے نام حکم نامہ ہے۔ نیز ان لوگوں کے نام جو ان کے تابع اور ساتھی ہوں اور ان کے ہمراہ ہو کر جہاد میں حصہ لیں۔

۲۔ یہ لوگ باہم مل کر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں ایک امت، (سیاسی وحدت) قرار پائیں گے۔

۳۔ قریش سے ہجرت کر کے آنے والے اپنے محلے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور اپنے خون بہا قبائلی نظام کے مطابق ادا کریں گے اور اپنے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ اہل ایمان کا باہمی نظام نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵ تا ۱۱۔ میں بنو حارث بن الخزرج۔ بنو ساعدہ۔ بنو جشم۔ بنو النجار۔ بنو عمرو بن عوف۔ بنو النبیت اور بنو اوس کے نام بدل بدل کر دفعہ ۴ ہی کے الفاظ دہرائے گئے ہیں۔

۱۲۔ مومن کسی مقروض[1] کو دل کھول کر مدد دیئے بغیر نہ رہیں گے تاکہ ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔

کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولا[2] (غلام) سے اتحاد کا معاہدہ نہ کرے گا۔

۱۳۔ متقی مومنین ہر اس شخص کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے جو ان کے درمیان سرکشی یا استحصال بالجبر کرے گا یا گناہ، زیادتی اور فساد امت کا باعث بنے۔ مومنین باہم مل کر سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے خواہ وہ ظالم مومنوں میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۔ کوئی مومن کسی مومن کو کافر کے بدلے قتل نہ کرے گا اور نہ غیر مومن کا مددگار بنے گا۔

۱۵۔ اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے، مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی

---

[1] یہ "مفرح" کا ترجمہ ہے جس کے معنی "مصیبت زدہ، دکھی اور پریشان حال" ہیں۔ افلاس زدہ کے لئے بھی مستعمل ہے۔ بعض نسخوں میں یہ لفظ "مفرج" یعنی جیم سے آیا ہے۔ مفرج وہ مقتول ہے جو دو بستیوں کے درمیان پایا جائے، لیکن قاتل معلوم نہ ہو۔ [2] مولا کا ترجمہ غلام اور ساتھی دونوں آتا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسی لئے مولا سے مراد معاہد بھائی لیا ہے۔

عائد کرسکے گا۔ مومنین باہم ایک دوسرے کے مددگار اور کارساز ہوں گے۔

۱۶۔ جو یہودی ہماری اتباع کریں گے ان کے ساتھ انصاف اور مساوات کا سلوک کیا جائے گا۔ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۷۔ مومنوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ جہاد فی سبیل اللہ میں کوئی مومن دوسرے مومنوں سے کٹ کر (دشمن سے) صلح نہ کرے گا۔ جب تک (یہ صلح) ان سب مومنوں کے لئے مساوی اور یکساں نہ ہو۔

۱۸۔ جو لوگ ہمارے ساتھی ہو کر لڑیں گے انہیں باہم نوبت بہ نوبت چھٹی دی جائے گی۔

۱۹۔ مومنین کا جو خون راہ خدا میں بہے گا، اس کے انتقام کے لئے باہم تعاون کریں گے۔

۲۰۔ اور بلاشبہ متقی مومنین بہترین اور صراط مستقیم پر ہیں۔ اور یہ کہ کوئی مشرک[1] قریش کی جان یا مال کو پناہ نہ دے گا اور اس سلسلے میں نہ مومنوں کے آڑے آئے گا۔

۲۱۔ جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس کے کہ مقتول کا وارث خون بہا لینے پر رضامند ہو جائے۔ تمام مومن اس کی تعمیل کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے، اور اس کے سوا ان کے لئے کوئی چیز جائز نہ ہوگی۔

۲۲۔ جو مومن اس صحیفے (دستاویز) کو منظور کر چکا ہو اور خدا و یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو۔ اس کے لئے یہ امر درست نہ ہوگا کہ کسی مجرم کو مدد یا پناہ دے ورنہ روز آخرت اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوگا اور اس سے کوئی تاوان قبول نہ ہوگا۔

۲۳۔ اور یہ کہ جب تم میں کسی معاملے کے بارے میں اختلاف پیدا ہو تو اسے خدا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے رجوع کیا جائے گا۔

۲۴۔ اور یہودی اس وقت تک مومنین کے ساتھ جنگی اخراجات برداشت کرتے رہیں گے۔ جب تک مومن جنگ میں مصروف رہیں گے[2]

۲۵۔ بنی عوف کے یہودی اور ان کے موالی مومنوں کے ساتھ مل کر ایک امت (سیاسی وحدت)

---

[1] "مشرک" سے مراد وہ یہودی ہیں جن سے صلح کی گئی تھی۔ مقصود یہ ہے کہ یہودیوں سے صلح کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مومنین کے دشمنوں کو پناہ دیں اور ان کی مدد کرتے رہیں۔

[2] یہ دفعہ فتح و شکست دونوں صورتوں میں برابر نافذ ہوتی تھی۔ اخراجات کی صورت میں یہودی اخراجات برداشت کرتے تھے اور فتح پر غنیمت میں ان کو حصہ دیا جاتا تھا۔ (کتاب الاموال ص ۲۶۲)

میں گے۔ یہودیوں کا اپنا دین اور مومنوں کا اپنا دین ہو گا۔ البتہ جو لوگ جرم یا گناہ کے مرتکب ہوں گے وہ اپنے خاندانوں اور اپنے آپ ہی کو مصیبت میں ڈالیں گے۔

۲۶۔ بنی النجار کے یہودیوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۷ تا ۳۳۔ ان دفعات میں بنی حارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی اوس، بنی ثعلبہ، (شاخ قبیلہ ثعلبہ) اور بنو شطیبہ کے بارے میں دفعہ ۲۶ کے الفاظ ہی دہرائے گئے ہیں۔

۳۴۔ ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۵۔ یہودی قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۶۔ کوئی یہودی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا۔ کسی مار یا زخم کے انتقام کی ممانعت نہیں ہوگی، جو خونریزی کرے گا، وہ اور اس کا گھرانہ اس شخص کے روبرو جوابدہ ہوگا جس کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ خدا اس کے ساتھ ہے جو اس (دستاویز) کی زیادہ سے زیادہ وفاشعاری سے تعمیل کرے گا۔

۳۷۔ یہودی اپنے مصارف، کے ذمہ دار ہوں گے اور مومنین اپنے مصارف کے۔ جو کوئی اس معاہدے کے شرکا سے جنگ کرے گا وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ان کا باہمی سلوک حسن مشورہ اور خیر خواہی پر مبنی ہوگا۔ برائی اور بدی قطعاً راہ نہ پائے گی۔

۳۸۔ یہودی جب تک مومنین کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں گے وہ اپنے مصارف کے خود ذمہ دار ہوں گے۔

۳۹۔ اس معاہدے میں شامل ہونیوالوں کے لئے یثرب کا جوف (پہاڑوں سے محصور میدان) ایک حرم (یعنی مقدس مقام) ہوگا۔

۴۰۔ پناہ گزین کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو پناہ دہندہ کے ساتھ۔ اسے ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود ہی عہد شکنی کرے گا۔

۴۱۔ کسی خاندان کے افراد کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہ دی جائیگی (یعنی پناہ گزین کسی کو پناہ نہ دے سکے گا۔

۴۲۔ اگر ان معاہدہ کرنے والوں میں کوئی قتل یا جھگڑا ہو جائے جس سے نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اسے خدا اور خدا کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ خدا اس شخص کا ساتھی ہے جو اس معاہدے پر احتیاط اور وفاشعاری سے عمل کرے گا۔

۴۳۔ قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہ دی جائے گی۔

۴۴۔ جو یثرب پر حملہ آور ہوں تو یہ معاہدہ کرنے والے باہم مل کر مقابلہ کریں گے۔

۴۵۔ اگر ان (یہودیوں) کو کسی صلح کی دعوت دی جائے تو یہود صلح کر لیں گے، اسی طرح وہ (یہودی) مومنین کو کسی صلح کی طرف بلائیں گے تو مومنین بھی اس دعوت کو قبول کر لیں گے، بجز اس کے کہ کوئی دینی جنگ ہو ـــ ہر گروہ کے حصے میں اسی رُخ کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہوگا۔

۴۶۔ (قبیلہ) اوس کے یہودیوں کو، موالی ہوں یا آزاد، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس معاہدہ میں شامل ہونے والوں کو، اور وہ اس معاہدے پر خوبی و عمدگی سے عمل پیرا ہوں گے۔ خدا اس کا حامی و ناصر ہے جو معاہدے پر زیادہ سے زیادہ صداقت اور وفاشعاری سے عمل کرے گا۔

۴۷۔ اس معاہدے کی مخالفت صرف ظالم یا گناہ گار ہی کرے گا، جو لوگ جنگ کے لئے نکلیں گے وہ امن سے ہوں گے، جو یثرب میں ہوں گے ان میں ظالموں اور گناہگاروں کے سوا کوئی غیر محفوظ نہ ہوگا۔ جو اس معاہدے کے پابند ہوں گے اور اس پر عمل پیرا، خدا اور محمد رسول اللہ ان کے محافظ ہیں

معاہدہ تین پارٹیوں یعنی مہاجرین، انصار اور یہودیوں کے مابین ہے۔ مہاجرین وہ قریشی مسلمان ہیں جو مکے سے ہجرت کر کے مدینہ میں آباد ہوئے، انصار وہ اہل ایمان کا گروہ ہے جس نے مہاجروں کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کر دئے۔ مہاجرین اور انصار سماجی اور معاشی حیثیت میں کسی طور یہودیوں سے بہتر نہ تھے، جو پناہ لینے آئے ہیں، غریب اور مفلس ہیں اور پناہ دینے والے بھی یہود کے مقابلہ میں کوئی زیادہ صاحب اثر نہیں۔ لیکن حیران کن امر یہ ہے کہ معاہدے میں مغلوبانہ تو کجا مساویانہ بھی نہیں بلکہ حاکمانہ اختیارات ان ہی بے زر لوگوں کو حاصل ہوئے۔ معاہدے پر غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک طاقتور اور مربوط جماعت زیر دستوں سے معاہدہ کر رہی ہے۔

معاہدے کی دفعات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جس عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی ہے یہ اُس دوستی کا بنیادی دستور ہے، معاہدے میں شامل ہونے والے جملہ قبائل انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک قبیلے کی عہد شکنی سے معاہدہ کالعدم نہیں ہوتا، بلکہ صرف عہد شکن

معاہدہ کا متن لکھتے ہوئے "کتاب الاموال ۵۱۷"، "عہد نبوی کا نظام حکمرانی" اور مجید خدوری کی کتاب "WAR AND PEACE IN THE LAW OF ISLAM" مدنظر رہی ہے۔ نیز متن میں لفظی ترجمے سے زیادہ مطلب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ (انتر راہی)

قبیلے پر ہی اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب یہودیوں کا ایک قبیلہ برسر جنگ ہوتا تھا تو دوسروں سے سابقہ روابط ہی قائم رہتے تھے۔

معاہدہ کب ہوا۔؟ | جملہ مسلم مورخین کا خیال ہے کہ یہ دستاویز (معاہدہ) ۱ھ میں مرتب ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی رائے یہ ہے کہ معاہدے کا پہلا حصّہ تو ۱ھ میں مرتب ہوا لیکن دوسرا حصّہ جنگ بدر کے بعد ترتیب پایا، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کے ساتھ ہی یہود سے معاہدہ قرین قیاس نہیں کیونکہ یہود ایک اجنبی فرد کی اطاعت کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے لیکن جب جنگ بدر میں قریش کی طاقت کو سخت دھچکا لگا تو یہودیوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور یہودی بھی معاہدے میں شریک ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مندرجہ بالا رائے کی تائید کسی تاریخی حوالے سے نہیں ہو سکتی، انہوں نے مشہور لغت "لسان العرب" پر انحصار کرتے ہوئے یہ رائے قائم کی جسے ابوداؤد کی ایک روایت سے مزید تقویت پہنچی۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے، کیونکہ اگر معاہدہ جنگ بدر کے بعد ترتیب پائے تو بنی قینقاع کے اخراج کو موخر کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ شوال ۲ھ میں بنی قینقاع کو لاوطن کیا گیا۔ اور جملہ مورخین ان کی عہد شکنی اور جنگی کارروائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ معاہدے کے پہلے حصّہ میں دفعہ ۲۰ یہ ہے:

"بلاشبہ متقی مومنین بہترین اور صراط مستقیم پر ہیں۔ اور یہ کہ کوئی مشرک قریش کی جان و مال کو پناہ نہ دے گا۔ اور نہ اس سلسلے میں مومنوں کے آڑے آئیگا۔"

اس دفعہ میں "مشرک" کا لفظ یہودیوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ کئی مورخین نے سمجھا ہے۔

بنو قینقاع کا نقض معاہدہ | یہود مدینہ کے جملہ قبائل میں بنو قینقاع سب سے زیادہ بہادر اور نڈر تھے۔ ان لوگوں نے غزوہ بدر کے معاً بعد معاہدہ توڑ دیا۔ اس خاص موقع پر نقض معاہدہ کی اس کے علاوہ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ انہوں نے سمجھا کہ مسلمان اس وقت کمزور ہیں اور ہم ان سے ٹکرا سکتے ہیں۔

نقض معاہدہ کے اعلان کے ساتھ ہی اس کا مظاہرہ بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک انصاری کی بیوی مدینہ کے بازار میں خرید و فروخت کے لئے گئی۔ یہودیوں نے عورت کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان یوں سر بازار مسلمان عورت کی بے حرمتی برداشت نہ کر سکا اور یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے انتقام میں مسلمان کو شہید کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب حالات کا علم ہوا تو آپ نے کوئی جارحانہ قدم اٹھانے

کی بجائے بنو قینقاع کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور اکڑے رہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:

"خدا سے ڈرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بدر والوں کی طرح عذاب الٰہی تمہیں بھی پا لے۔"

آنحضرت کے اس واضح انتباہ کے باوجود انہوں نے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں ہیں۔ وقت آنے پر ہم دکھا دیں گے کہ لڑائی اسے کہتے ہیں۔

بنو قینقاع کے اس واضح اعلان جنگ کے بعد لڑائی ٹھن گئی۔ بنو قینقاع قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمانوں نے پندرہ دن تک محاصرہ کئے رکھا آخر وطن چھوڑ جانے کی شرط پر صلح ہوئی۔

عبداللہ بن ابی رئیس المنافقین ان کا حلیف تھا۔ اس نے آنحضرت سے درخواست کی تھی کہ وہ جلاوطن کر دئیے جائیں۔ چنانچہ سات سو اشخاص جن میں سے تین سو زرہ پوش تھے۔ وادی القریٰ سے ہوتے ہوئے شام چلے گئے۔

بنو نضیر کی سرکشی غزوہ بدر میں مشرکین مکہ کو اذیت ناک شکست ہوئی۔ اس کا بدلہ چکانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کعب بن اشرف کے مرثیوں نے ان کی خواہش انتقام کو مزید بڑھا دیا۔ کعب بن اشرف یہودیوں کا مشہور شاعر تھا۔ اس کا والد اشرف قبیلہ طے کا فرد تھا، لیکن مدینہ میں بنو نضیر کی حلیفی میں اس قدر آگے بڑھ گیا تھا کہ آخر یہودی تاجر ابورافع کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اسی لڑکی کے بطن سے کعب پیدا ہوا تھا۔ کعب اس دو طرفہ رشتہ داری کی بدولت مشرکین کی شکست پر نوحہ کناں تھا۔ مشرکین نے یہود کو سرکشی پر اکسایا اور مکہ سے انہیں خط لکھا کہ:

"تم جائدادوں اور قلعوں کے مالک ہو، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑو ورنہ ہم تمہارے ساتھ ایسا اور ایسا سلوک کریں گے۔ حتیٰ کہ تمہاری عورتوں کی پازیبیں تک اتار لیں گے۔"

ان خطوط سے بنو نضیر نے یہ تصور کیا کہ مشرکین مکہ کے علاوہ بنو قریظہ بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہو جائیں گے۔ چنانچہ ۴ھ میں بنو نضیر نے سرکشی اختیار کی لیکن سرکشی کے وقت سب تدبیریں الٹی ہو گئیں، نہ تو بنو قریظہ ہی کو جرأت ہوئی اور نہ مشرکین مکہ ہی پہنچ سکے۔ آخر قلعہ بند ہو گئے، جب کوئی چارہ کار نہ تھا تو اس شرط پر صلح کی کہ جس قدر مال اونٹوں پر لے جا سکیں لے کر مدینہ چھوڑ دیں۔

چنانچہ بنو نضیر نے اپنا سامان چھ سو اونٹوں پر لادا اور شادیانے بجاتے اور خوشی کے نغمے گاتے ہوئے خیبر چلے گئے۔ غالباً ان کی خوشی کا یہی سبب تھا کہ واضح اور علانیہ بغاوت کے باوجود ان کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کیا گیا جس میں انتقام کی بو تک نہ پائی جاتی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے

کی پوری پوری تیاری کی تھی اور ہمت ہار دینے کے بعد ہی یقین کئے بیٹھے تھے کہ ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لیکن یوں بچے کہ آنچ تک نہ آئی۔

بنونضیر کے چلے جانے کے بعد جو اسلحہ کا ذخیرہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا اس میں پچاس زرہیں پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔

جنگ احزاب بنونضیر مدینے سے تو شادیانے بجاتے چلے گئے لیکن خیبر پہنچ کر عظیم الشان سازش تیار کر لی۔ ان کے لیڈر سلام بن ابی الحقیق، کنانہ بن ربیع اور حیی بن اخطب مکہ جا کر قریش کے سرداروں سے ملے اور انہیں مسلمانوں کے خاتمے کے لئے مشترکہ سازش میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا۔ قریش اور یہود کی مشترکہ سازش میں قبیلہ غطفان، بنواسد، بنوسلیم اور بنوسعد بھی شریک ہو گئے۔

آخر ۵ھ میں دس ہزار کا لشکر ابوسفیان بن حرب کی سرکردگی میں مدینہ کی طرف بڑھا۔ مسلمانوں نے مقابلے کا عجیب طریقہ اختیار کیا جو اس سے پہلے عرب میں اختیار نہیں کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کے کہنے پر خندق کھود دی۔ اور خود مسلّح ہو کر مدینہ میں بیٹھ گئے۔

مدینہ میں بنو قریظہ موجود تھے۔ اور مسلمانوں سے ان کا معاہدہ تھا۔ رات کی تاریکی میں بنونضیر کا سردار حیی بن اخطب ان سے ملا اور بنو قریظہ کو نقضِ معاہدہ پر آمادہ کر لیا۔ آنحضرت نے اپنے نقیبوں کے ذریعہ بنو قریظہ کو باز رہنے کی تلقین کی لیکن بے سود۔

اس نئی پیش آمدہ صورتِ حال سے مسلمانوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بنو قریظہ نے شہری نظم و نسق میں خلل ڈال دیا۔ جنگ کی حالت میں جب مسلمانوں کی تعداد پہلے ہی کم تھی۔ ایک ہزار افراد کو شہر کی حفاظت کے لئے مامور کرنا پڑا۔

حملہ آور فوج بیس دن محاصرہ کئے رہی۔ جب ان کی پیش نہ گئی، تو ایک رات خود ہی ڈیرے ڈانڈے اٹھا کر رفو چکر ہو گئی۔ بنو قریظہ کے تمام خیالی منصوبے خاک میں مل گئے اور مسلمانوں کو ہمیشہ سے ختم کرنے کی سازشیں ناکام ہو گئیں۔

بنو قریظہ کا خاتمہ حملہ آور فوج کے محاصرہ اٹھا لینے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو قریظہ سے نقضِ عہد کی وضاحت طلب کی۔ بنو قریظہ قلعہ بند ہو گئے اور مبارزت طلب ہوئے۔ مسلمانوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ بنونضیر کا سردار حیی بن اخطب بنو قریظہ کے قلعہ میں موجود ہے۔ مسلمانوں نے ذی الحجہ ۵ھ میں محاصرہ کر لیا جو پچیس دن تک جاری رہا۔ آخر محاصرہ کی سختی سے تنگ آ کر بنو قریظہ چیخ اٹھے۔ انہوں نے قبیلہ اوس کے مسلمانوں کو صلح کی خاطر درمیان میں ڈالا۔ عہد جاہلیت میں اوس اور ان کے درمیان دوستانہ

تعلقات موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست منظور کرلی کہ قبیلہ اوس کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ ان کا فیصلہ کریں۔

حضرت سعدؓ بن معاذ نے فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کر دئیے جائیں، عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیا جائے اور ان کا مال مسلمانوں میں بانٹ دیا جائے۔ چنانچہ یہ فیصلہ نافذ کیا گیا اور اس کے مطابق بنو قریظہ کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا گیا۔

مؤرخین نے اس واقعہ کو قلمبند کیا ہے، اور غیر مسلم مستشرقین نے اسے اپنی "نام نہاد تحقیقات" کے لئے خوب استعمال کیا اور مسلمانوں کو خونخوار اور ظالم و سفاک ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، لیکن درج ذیل امور کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت سعدؓ کا فیصلہ مبنی بر انصاف تھا اور بنو قریظہ اسی سلوک کے مستحق تھے۔

۱۔ بنو قریظہ نے اس نازک وقت بدعہدی کی جب مسلمان جنگ میں گھرے ہوئے تھے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو نہایت پریشان کیا حتیٰ کہ حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو مجبور ہو کر تہیہ کرلیا تھا کہ مدینہ کی پیداوار کا تیسرا حصہ دے کر حملہ آوروں سے مصالحت کرلی جائے۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۲۸۱)

قرآن حکیم میں اس پریشانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

إِذْ جَاءُوكُمْ مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ
وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا۔ (احزاب: ۱۰)

یعنی جب وہ تم پر بالائے شہر اور پائین شہر کی جانب سے چڑھ دوڑے اور جب تمہاری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دل منہ کو آنے لگا۔ اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔

——— اس بدعہدی اور یہودیوں کے دوسرے قبائل کے طرزِ عمل کے پیش نظر ان سے یہ توقع بے سود تھی کہ آئندہ وہ ایسی بدعہدی نہ کریں گے۔

۲۔ ان کے قلعے مدینے سے قریب تھے اور ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا کہ وہ کسی وقت بھی دشمنوں سے ساز باز کرکے مسلمانوں کی جان کے درپے ہو سکتے تھے۔

۳۔ ان کو جلاوطن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان سے پہلے بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا، اور ان کی سازش جنگِ احزاب کی شکل میں نمودار ہوئی۔

۴۔ جملہ بدعہدیوں کے باوجود آنحضرت نے از خود کوئی فیصلہ نہیں دیا بلکہ یہودیوں کی مرضی اور اتفاق

سے حکم چنا گیا جس کے فیصلے پر عمل کیا گیا۔

۵۔ سعدؓ بن معاذ نے جو فیصلہ دیا وہ تورات کے احکام کے مطابق تھا۔ اور یہودیوں کو اسے رد کرنے کا اختیار نہ تھا۔ "استثناء" میں ہے:

"جب تو کسی شہر کے پاس اس سے لڑنے کے لئے پہنچے تو پہلے اس سے صلح کا پیغام کر، تب یوں ہوگا کہ اگر وہ تجھے جواب دے کہ صلح منظور اور دروازہ تیرے لئے کھول دے تو ساری خلق جو اس شہر میں پائی جائے۔ تیری باجگزار ہوگی اور تیری خدمت کرے گی۔ اور اگر وہ تجھ سے صلح نہ کرے، بلکہ تجھ سے جنگ کرے تو اس کا محاصرہ کر۔ جب خداوند تیرا خدا اسے تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر۔ مگر عورتوں اور بچوں اور جانوروں کو جو کچھ اس شہر میں ہو اپنے لئے غنیمت کے طور پر رکھ لے۔ (استثناء باب ۲۰ آیت ۱۰-۱۴)

۶۔ بنو قریظہ کے صرف ان لوگوں کو قتل کیا گیا جو لڑائی کرنے کے قابل تھے، اور جن سے دوبارہ فساد انگیزی کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ باقی رہا عورتوں اور بچوں کا معاملہ، تو ان کی کفالت کرنے والوں کے قتل کے بعد بجز اس کے اور کیا وسیلہ ہو سکتا ہے۔ کہ خود مسلمان ہی ان کی کفالت کا بوجھ برداشت کریں۔

مندرجہ بالا وجوہ وعلل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا کہ بنو قریظہ کے ساتھ سخت گیری برتی گئی، کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کے ساتھ کیا گیا سلوک عین انصاف کے مطابق تھا۔

بنو قریظہ کے خاتمے کے بعد یہود مدینے کی سیاست سے مکمل طور پر ہٹ گئے۔

بروایت حضرۃ حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ

مرتبہ محمد اقبال قریشی ہارون آبادی

علوم و معارف حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ

فرمایا: ایک بار میں نے ایسی نادانی کی بات کی کہ حضرت حاجی صاحبؒ سے درخواست کی کہ اپنے حالات بطور کچھ سوانح لکھوا دیجئے۔ آپ نے جواب دیا کہ کیا خوب اپنے منہ میاں مٹھو بنوں۔ واقعی اپنے کو بزرگ سمجھنا کیا ہے۔ (راس الاربعین)

فرمایا: ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس ایک بیمار شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ حضرت میں بیمار ہو گیا تھا، اور افسوس ہے کہ میں مسجد حرام میں نماز نہ پڑھ سکا، آپ نے اس کے واسطے دعائے صحت فرمائی اور رخصت کیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جب عرفاؔ کا مجمع رہ گیا تو فرمایا کہ یہ شخص عارف ہوتا تو ہرگز نہ قلق نہ کرتا۔ کیونکہ جسطرح وصول کی یہ صورت ہے کہ حرم میں نماز پڑھو۔ یہ بھی ایک صورت ہے کہ عذر سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو، اس لئے عارف کی نظر میں دونوں حالتیں وصول کا سبب ہیں، اور یکساں ہیں۔ عارف تو ایک بندہ رضا جو ہے اس کا مقصود ادائے صلوٰۃ ہے اگر مسجد حرم میں ہو سکتا تو وہاں ادا کرتا۔ اور عذر یا بیماری کی وجہ سے وہاں نہ ادا کر سکتا تو اپنے گھر پر کرتا اور حسب حدیث نماز کا وہی اجر ملتا جو تندرستی کی حالت میں حاضری حرم سے ملتا ہے۔ (الدنیا والآخرۃ)

فرمایا: طلب دنیا یعنی دنیا کمانا تو برا نہیں لیکن حب دنیا برا ہے۔ ہمارے حضرتؒ نے اسکی ایک مثال دی ہے۔ کہ مال مثل پانی کے ہے اور قلب مثل کشتی کے ہے

آب در کشتی ہلاک کشتی است — آب اندر زیر کشتی پشتی است

یعنی پانی کشتی کا معین ہے اور اسکو ڈبونے والا بھی ہے۔ اسطرح کہ کشتی سے باہر ہے تو معین ورنہ مہلک۔ اسی طرح مال ہے کہ اگر مال قلب سے باہر صرف ہاتھ میں ہے تو معین اور اگر قلب کے اندر اسکی محبت ہے تو مہلک ہے۔ اسی کو کہا ہے ؎

مال را گو بہر دین باشی حمول — نعم مال صالح گفت آں رسولؐ

یعنی مال کو اگر دین کے لئے جمع کرو تو اسکو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا مال فرمایا ہے۔ حدیث میں ہے نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ - یعنی نیک مرد کی پاک کمائی اچھا مال ہے۔ عارف باللہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے خوب فرمایا ہے ؎

کسب دنیا تو کر ہوس کم کر ۔۔۔ اس پہ تو دین کو مقدم کر

فرمایا: ہمارے حاجی صاحبؒ نے بھی وصیت کرنا چاہی تھی کہ میرے جنازے کے ساتھ ذکر بھر ہوتا چلے، مگر مولوی اسمٰعیل صاحبؒ نے اختلاف کیا اور کہا حضرت یہ ایک نئی بات ہے کہیں رفتہ رفتہ بدعت کا دروازہ مفتوح نہ ہو جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا بہت اچھا جیسی رائے ہو۔ جب جنازہ کو لے کر چلے تو سب خاموش چل رہے تھے کہ ایک عرب نے کہا مَالَكُمْ سَاكِتِيْنَ اذْكُرُوا اللهَ - یعنی خاموش کیوں چل رہے ہو خدا تعالیٰ کو یاد کرو۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ بے اختیار سارا مجمع ذکر بھر کرنے لگا۔ مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کہنے لگے میں نے حضرتؒ کو اس امر کی وصیت سے روک دیا تھا۔ اسکو کون روکتا۔ حق تعالیٰ نے حضرتؒ کی مراد خود پوری فرما دی[۲]۔ حضرت مولانا رومؒ نے سچ فرمایا ہے ؎

مے دہد یزداں مراد متقیں ۔۔۔ تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں

فرمایا: کہ مولوی تجمل حسین صاحبؒ بہار کے ایک شخص تھے۔ مثنوی اچھی پڑھتے تھے۔ کانپور میں میری بھی ان سے ملاقات ہوئی، حضرت حاجی صاحبؒ سے بڑا تعلق رکھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں حضرت حاجی صاحبؒ کا قوال ہوں۔ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادیؒ کے مرید تھے۔ حج کیلئے مکہ معظمہ گئے۔ چونکہ صبح کے وقت شافعی مصلیٰ پر ذرا لطف ہوتا ہے۔ اکثر لوگ صبح کی نماز اسی مصلیٰ پر پڑھتے ہیں۔ وقت بھی اچھا قرأت بھی طویل۔ اس وقت ایک قسم کا لطف ہوتا ہے جس وقت شافعیہ قنوت پڑھتے ہیں، حنفیہ چپ کھڑے رہتے ہیں۔ جب شافعی قنوت پڑھنے لگے تو ان پر ایک حالت طاری ہوئی۔ انہوں نے پند نامہ کی مناجات شروع کی ؎

پادشا جرم مارا در گذار ۔۔۔ ما گناہ گاریم تو آمر زگار

نہایت ذوق و شوق اور درد کے ساتھ اسکو پڑھتے رہے۔ نماز کے بعد لوگوں میں اس کا چرچا ہوا۔ حضرت حاجی صاحبؒ سے بھی اسکی شکایت ہوئی مگر حضرتؒ چونکہ عارف تھے، صاحبِ حال پر ملامت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ حضرات عارفین کو لغزش کا منشاء معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت سنتے رہے اور ہنستے رہے۔ کیونکہ نماز تو فاسد ہوئی نہ تھی، چنانچہ فقہا نے لکھا ہے کہ نماز

[۱] التقویٰ ص۳۱ [۲] خیر الحیات والممات ص۱۰ [۳] فضائل العلم ص۵۹

کے اندر دعا اگر غیر عربی میں ہو تو حرام ہے مگر مفسد صلوٰۃ نہیں اور حرمت اس لئے نہ تھی کہ مغلوب الحال تھے معذور تھے۔ اس لئے حضرت تبسم فرماتے رہے، باقی زبان سے اس تفصیل کا اس لئے اظہار نہ فرمایا کہ فتنہ ہوگا۔ اس موقع پر حضرتؒ کی جامعیت پر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔[1] ع

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

فرمایا، ہمارے حاجی صاحبؒ اور حافظ محمد ضامن صاحبؒ کی رائے میں بیعت کے متعلق اختلاف تھا۔ حافظ صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ طالب طریق کو اصلاح اخلاق کا طریقہ اوّل تبلادیا جائے جب اخلاق درست ہو جائیں تب داخل سلسلہ کیا جائے اور حاجی صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ اول سلسلہ میں داخل کر لیتے۔ پھر اصلاح فرماتے تھے، پھر اصلاح یا تو شیخ کی برکت سے ہو جائے یا کسی کی حرکت سے ہو جائے یعنی وہ حرکت یا مرید کی طرف سے ہو یا شیخ کو اجازت دو کہ وہ حرکت کر کے تمہاری مرمت کیا کرے تو صاحب حاجی صاحبؒ میں تو برکت بہت زیادہ تھی اس لئے وہاں داخل سلسلہ کرتے ہی مرید کی اصلاح ہو جاتی تھی اور ہم لوگوں میں یہ برکت کہاں، یہاں تو حرکت سے کام چلے گا۔ ایک رند صاحب مجھ سے خود ایک قصہ بیان کرتے تھے کہ وہ حضرتؒ کی خدمت میں بیعت ہونے آئے اور کہنے لگے میں اس شرط پر بیعت ہوتا ہوں کہ ناچ دیکھنا نہ چھوڑوں گا، اور نماز نہیں پڑھوں گا۔ حضرت نے یہ شرط منظور فرمائی اور فرمایا ایک شرط ہماری بھی ہے وہ یہ کہ ہم کچھ مختصر سا ذکر تبلادیں گے۔ تم روزانہ اسے بلاناغہ کر لیا کرنا۔ اس نے یہ شرط منظور کر لی اور حضرتؒ نے اسے بیعت فرما لیا۔ یہاں اہل ظاہر کو شبہ ہوگا کہ حضرتؒ نے اس شخص کو ناچ دیکھنے اور نماز نہ پڑھنے کی اجازت دے دی۔ بلکہ یہ محض ظاہر میں اجازت دی تھی اور باطناً اسکو اچھی طرح جکڑ لیا تھا۔ یہ واقعہ اس واقعہ کی نظیر ہے، جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ وفد بنی ثقیف نے اسلام لانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ شرط کی تھی کہ ہم زکوٰۃ نہ دیں گے اور جہاد نہ کریں گے جضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شرط کو منظور فرما لیا، صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اشکال پیش آیا اور انہوں نے آپ سے دریافت کیا تو فرمایا ان کو اسلام تو لانے دو، اسلام لانے کے بعد وہ سب کچھ کریں گے۔ واقعی اسلام لانے کے بعد انہوں نے سب کچھ کیا۔ اسی طرح حاجی صاحبؒ کو حق تعالیٰ کے بھروسہ پر اعتماد تھا کہ خدا تعالیٰ کا نام لینا، یہ جب شروع کرے گا۔ تو نماز بھی پڑھے گا اور ناچ بھی چھوڑ دیگا۔ چنانچہ حضرتؒ کا خیال درست ہوا۔ حضرتؒ کی برکت، دعا و توجہ کا اس طرح حق تعالیٰ نے ظہور فرمایا کہ جب بیعت ہونے کے بعد پہلی ہی نماز کا وقت آیا تو اس شخص کے بدن میں خارش پیدا ہوئی، گویا ایک

[1] اشرف التنبیہ دارواح ثلثہ ص۹۳

عیبی سپاہی مسلط ہوگیا۔ خارش اس طرح بڑھی کہ ذراسی دیر میں بے چین کر دیا۔ اور جو تدبیریں کیں زیادتی ہوتی چلی گئی۔ پھر معاً یہ خیال آیا کہ ذرا ٹھنڈے پانی سے منہ دھولیں۔ شاید اس سے گرمی کو کچھ سکون ہو۔ ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال کر خیال ہوا لاؤ وضو ہی کرلیں، وضو کا پورا ہونا تھا کہ آدھی خارش کم ہوگئی، پھر خیال ہوا کہ لاؤ نماز بھی پڑھ لیں، کوئی نماز پڑھنے سے قسم تو نہیں کھائی۔ ہاں پیر سے یہ شرط کر لی ہے کہ نماز کی پابندی نہ کرنے پر مجھے ٹوکا نہ جائے۔ چنانچہ نماز کو کھڑے ہوگئے، نماز کا شروع کرنا تھا کہ خارش کو بالکل سکون ہوگیا۔ ایک وقت تو اسکو اتفاقی امر سمجھا مگر جب دوسرے اور تیسرے وقت یہی کیفیت ہوئی کہ نماز کے وقت خارش اٹھتی اور یہ آدھی تو وضو سے کم ہو جاتی اور نماز سے بالکل سکون ہو جاتا، تو وہ شخص سمجھ گیا کہ یہ پیر کی کرامت ہے۔ مجھ سے تو کہہ دیا کہ شرط منظور ہے اور اندر ہی اندر ایک سپاہی مسلط کر دیا پھر وہ نماز کے پابند ہو گئے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ پانچ وقت دربار الٰہی میں حاضری دے کر پھر ناچ گیا دیکھیں۔ سو ناچ سے بھی ان کو نفرت ہوگئی، تو حضرت رح کی ایسی برکت تھی کہ دوسرا کچھ کرنا بھی نہ چاہے جب بھی وہ دوسرے طریقے سے کام لے لیا کرتے تھے لیکن اب ایسی برکت کہاں۔ اب تو اسکی ضرورت ہے کہ طالب خود بھی کچھ کرے اور جو طریقہ بتلایا جائے۔ اس پر عمل کرے خواہ کامل مجاہدہ نہ کرے۔ اس سے تو انشاء اللہ چند روز میں محبت پیدا ہو جائے گی، اور چونکہ میرے شیخ کا یہی طرز تھا کہ وہ اوّل طالب کے اندر محبت پیدا کرتے تھے پھر اعمال وغیرہ کی اصلاح کرتے تھے۔ یہی طرز مجھے بھی پسند ہے تو محبت قائد ہے، اس سے خود بخود حق تعالیٰ کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ اور خوف سائق ہے، وہ پیچھے سے ہانکتا ہے۔ کہ گو جی نہ چاہے مگر زبردستی چلنا پڑتا ہے۔[1]

فرمایا: ہمارے حاجی صاحب رح کا واقعہ ہے کہ حضرت رح کو ایک شخص نے رقعہ دیا کہ آپ کا فلاں فلاں مرید ایسے ایسے کام کرتا ہے۔ اسکو منع کر دیجئے، ورنہ اندیشہ ہے کہ لوگ حضرت رح سے بے اعتقاد ہو جائیں گے۔ حضرت رح نے فرمایا بھائی دوسروں پر کیوں رکھتے ہو۔ اگر تمہارا جی بے اعتقاد ہونے کو چاہتا ہے تو تم بے اعتقاد ہو جاؤ اور مجھے تم لوگوں کی بے اعتقادی سے کیا ڈراتے ہو۔ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ مخلوق مجھے چھوڑ دے اور مردود سمجھ کر سب مجھ سے الگ ہو جائیں۔ ارے مجھے تو تمہارے اعتقاد نے پریشان کر دیا ہے۔ کہ مجھے اپنے خدا کو بھی یاد کرنے کا یکسوئی کیساتھ وقت نہیں ملتا۔ واقعی عاشق تو یہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ حال ہو[2]

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے ۔۔۔ کہ یارے برخورد از وصل یارے

---

[1] خیرالمیات والمماۃ ص۳۳ تا ص۳۶ [2] انفاظ القرآن ص۲۲

چوھدری محمد یوسف ایم اے
پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

ہم متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت مولانا فی سبیل اللہ فساد کے قائل نہ تھے، وہ گھپلا بازی اور خواہ مخواہ کی چخ چخ میں نہ خود الجھتے تھے، نہ دوسروں کو الجھانا مناسب خیال کرتے تھے۔ سلامت طبع اور اعتدال مزاج آپ کی فطرت کا جوہر زرنگار ہے، غالباً یہی وہ خوبی ہے جسکی بناء پر ہر کہ و مہ اور ہر کس و ناکس آپ کا والہ وشیدا نظر آتا ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ حضرت لاہوری میانہ روی کے دلدادہ تھے، لیکن یہاں ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہ کرنی چاہیئے، کہ حضرت مولانا جادۂ اعتدال پر گامزن ہونے کے باوجود حق گوئی اور حق اندیشی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آپ کا مشاہدہ عمیق تھا، اس لئے آپ کی عقابی نگاہوں سے کسی حقیقت کی جزئیات تک کا اوجھل ہونا ممکن نہ تھا۔ علاوہ ازیں جس بات کو سچ جانا، اسکی آبرو محفوظ کرنے میں حضرت مولانا سر دھڑ کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہ کرتے، بلاشبہ یہ ایک قابل فخر جوہر شخصیت ہے اسی سے شخصیت کے جملہ عناصر نشو و نما پاتے ہیں۔ خصوصاً اس دور میں تو حق گوئی ایک گوہر نایاب ہے کیونکہ آج ہر سو خود بینوں اور مصلحت اندیشوں کا ہجوم بے پایاں نظر آتا ہے۔ ہمارے نزدیک مصلحت بین خطیب و ادیب سے وہ شرابی ہزار درجہ بہتر ہے جو شراب کے نشہ میں سچی بات تو کہہ دیتا ہے۔

فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا
نکل جاتی ہو سچی بات جسکے منہ سے مستی میں

تاریخی واقعات و حقائق شاہد ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں مصلحت بینوں کے فرقہ ہائے باطلہ

نے حق گوئی کے چہرے کو مسخ کردیا، یہ علیحدہ بات ہے کہ حق ہر دور میں زندہ رہا ہے، چاہے اسے زندہ درگور کرنے کے لئے وقت کے طالع آزماؤں نے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ حق کی آواز وقتی طور پر تو دبائی جاسکتی ہے، لیکن ابدی زندگی کے خوشگوار لمحات حق کے مقدر میں رقم کئے جاچکے ہیں یہاں تک کہ آتشِ نمرود کے شعلے بھی حق و صداقت کی لطافتوں کو چاٹ نہ سکے بلکہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھی حق بآوازِ بلند یوں گویا ہوا ؎

میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش

کربلا کی سنگلاخ زمین اپنی تمام تر درشتی و سختی کے باوجود حق کے علم کو سرنگوں نہ کرسکی۔ یزید کی یزیدیت آج بھی نگوں سار اور شرمسار ہے۔ کہ وہ مکر و فریب اور شاطرانہ چالوں کے باوجود بھی حق کو مٹانے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ بلکہ حسینؓ کا کٹا ہوا سر، علی اکبرؓ کے رگوں سے بہتا ہوا خون اور جوان رعنا کی پنڈلی سے پھڑتا ہوا لہو یہ نعرہ حق بلند کرتا ہوا غلغلہ انداز ہوا ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

لیکن ایسے لوگ معدودے چند ہوا کرتے ہیں اور ان کا وجود تقریباً ناپید ہے جو حق و صداقت کی خاطر زندگی تک تصدق و نثار کرنے کے لئے بے قرار ہوں، یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ذاتی منفعت کی بناء پر فتوہائے حرام جاری کرنے سے بھی پہلو تہی کرتے نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان حضرات کے پیش نظر صرف ذاتی مفاد ہوتا ہے، اور اس کے حصول کی خاطر وہ سب کچھ فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کا سینہ چاک کرنے سے بہت سے سربستہ رازوں کا انکشاف ممکن ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے ایک دور میں ایک ایسا وقت بھی آیا۔ جب ہمارے پیروں اور واعظوں نے خانہ کعبہ کے در و دیوار کو چھلنی کرنے کے لئے تعویذ کی شمشیر تابدار دے دی۔ اور یوں مبالغہ آرائی کی کہ اس تعویذ کی مدد سے آپ دشمنوں کی تلوار کی زد سے محفوظ رہیں گے، اور دشمن گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ جائے گا۔

اس قسم کی فریب کاریوں سے تاریخ عالم کے صفحات بھرے پڑے ہیں جن میں ہمارے نام نہاد واعظوں نے بدکرداری کا کردار ادا کیا ہے۔ میرے نزدیک حق فروش ملّا سے وہ رنڈی بہتر ہے جو چند فاقوں کو ٹالنے کے لئے اپنی چادرِ عصمت کا سودا کرتی ہے، لیکن ان واعظانِ ناعاقبت اندیش کی طرح پوری قوم کی چادرِ عصمت فروخت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی ؎

تو نے عصمت فروخت کی ہے فقط ایک فاقہ کو ٹالنے کے لئے
لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں اپنا مطلب نکالنے کے لئے

عہد حاضر میں بھی ایسے واعظوں کی کمی نہیں جن کی ہر تقریر کا ہر جملہ جبینِ شاہی کے بل پر رقص فرما نہ ہوتا ہو۔ ہم انتہائی یقین و وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ننانوے فیصد واعظ امراء و سلاطین کی حریم ناز پر ناصیہ فرسائی کرتے دکھائی دیتے ہیں، ان کا ضمیر اور ان کی آواز شاہی خزانوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ ننگ دین، ننگ قوم اور ننگ وطن ہیں، جنہیں میر جعفر، امیر صادق ابولہب اور ابوجہل کی پلید مٹی نے جنم دیا ہے۔

ہم انتہائی انکسار سے معذرت خواہ ہیں کہ ہماری زبان قلم کس قدر گستاخ و بے ادب ہے جو واعظوں کی شان والا تبار کے حضور میں گستاخی و بیباکی سے تڑاق پڑاق چلتی رہتی ہے لیکن کیا کریں حقیقت یہی ہے اور حقیقت سے روگردانی ہمارے بس کی بات نہیں ہمیں اپنی گستاخی پر ناز ہے بلکہ یوں کہئے ؎

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

ہم علماء حق کی بارگاہ عظمت میں اونچی آواز سے بات کرنا بھی سوءِ ادب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایمان و الیقان ہے کہ اس قسم کے بزرگوں کی بدولت ہی اسلام کا تاج محل اپنی پوری شان اور سج دھج سے قائم دائم ہے اگرچہ علماء سوء کے پلید گروہ نے بارہا اس محل کی شان دلربائی کو زخمی کرنے کی کوشش کی ہے، اس لحاظ سے ہم حضرت مولانا لاہوریؒ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے، کیونکہ آپ نے اعتدال مزاج کے باوجود حق گوئی حق بینی اور حق اندیشی کو کسی وقت بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہ وہ مرد حق آگاہ تھا جس کی آواز سے فضائیں کانپ جاتی تھیں، محلات لرزہ براندام ہوتے تھے۔ کلاہِ شاہی کے پیچ ڈھیلے ہو جاتے تھے۔ اور شہنشاہوں کے گریبان غریبوں اور ناداروں کے قہقہوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے تھے۔

وہ غریبوں کا حامی تھا۔ پریشان حالوں کا مددگار اور غرورِ شاہی کو پاؤں تلے روند دینے کا فن جانتا تھا۔ یہ مرد حق آگاہ ایک طرف تو درویشوں کے جوتے سیدھے کرتا ہے اور دوسری طرف گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کو یوں مخاطب کرتا ہے:

اے نشتر! تو پاگل، تیری قوم پاگل، یہ جہان پاگلوں کا، اپنی دیوانگی کا علاج کراؤ، تمہاری دیوانگی کا علاج MENTAL HOSPITAL میں نہیں بلکہ قرآن کے سیپاروں میں ہے، اسے پڑھو، سمجھو، اور اپنی دیوانگی کا علاج کرو۔ اگر خود نہیں پڑھ سکتے تو میری خدمات حاضر ہیں، اپنے خرچ پر آؤں گا۔ اپنے خرچ پر جاؤں گا۔ تمہارے گھر کا کھانا حرام سمجھتا ہوں، تمہاری مصروفیات کے پیش نظر صرف دس

منٹ لوں گا۔ اور اس مختصر سی مدت میں پاکستان کا وہ نقشہ مرتب کر دوں گا کہ ایک عالم درجۂ حیرت میں ڈوب جائے گا۔"

کفر و باطل سے جہاد حضرت شیخ التفسیرؒ کا فوری مزاج کے بے ضرر انسان تھے، لیکن دجل و بطلان کے مقابلہ میں ایک کوہ گراں نظر آتے تھے، ہمالیہ کی بلندی، پہاڑ کی ہیبت اور سمندر کی گہرائی آپ کی صدق دلی کے سامنے پر کاہ کے برابر بھی درجہ نہ رکھتے تھے، کسی کی دل آزاری آپ کی فطرت کے خلاف تھا۔ دلجوئی آپ کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کے مابین ایک لطیف ربط و تعلق پیدا کرنے کے دلدادہ اور متمنی تھے، لیکن اس کوشش میں حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ بلکہ بڑی پامردی سے تصادمات حیات کے خلاف صف آراء ہو جاتے اور اس وقت تک سکون و قرار محسوس نہ کرتے۔ جب تک کہ کفر و الحاد اور دجل و بطل کی رگوں سے لہو کا آخری قطرہ تک نچوڑ نہ لیتے، امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ، شاہانہ کروفر، فلک بوس عمارات کا شکوہ اور کرسی اقتدار کی ہیبت، غرض کوئی شئے بھی آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بلکہ آپ قد و گیسو، دار و رسن، صبح و شام اور شب و روز کے اتار چڑھاؤ کے مابین کچھ اس طرح اظہار خیال فرماتے ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش　　میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ساتھیوں، رفیقوں، یاروں اور ہم عصروں سے چشمک نہ نی کرنا آسان ہے۔ لیکن حکومتوں کا بتِ کبریائی توڑنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اس کے لئے صور اسرافیل، ضرب ابراہیمی، اعصائے موسوی اور خلق مصطفوی کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا کو نہ صرف ماحول کے پیدا کردہ ہنگاموں سے متصادم ہونا پڑا۔ بلکہ برطانوی دیو استبداد کا سر کچلنے کے لئے عصائے موسوی کی ضرورت آن پڑی، ظاہر ہے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

حضرت فتنوں کے پروردگار نہ تھے بلکہ امن و آشتی اور صلح پسندی کے دلدادہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی آپ کی آنکھوں سے اوجھل نہ تھی۔ "وہ ہاتھ قابل قدر ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو۔ لیکن زندہ وہی رہ سکتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں شمشیر تابدار کا قبضہ ہو۔"

الغرض برطانوی تاجداروں سے یوم آزادی تک حصول آزادی کا حق مانگتے رہے، جیلوں میں گئے ہجرت بھی کی، فاقہ مستی تک بھی نوبت آئی لیکن تحریک آزادی کا یہ مجاہد برابر آواز بلند کرتا رہا۔ ع

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آلام و مصائب کے ہجوم میں بڑے بڑے دل گردے والوں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر مصلحت کی کمین گاہ بنا لیتے ہیں، لیکن حضرت مولانا مصائب کا دل پھیر کر برابر منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ مصلحت بینی بھی عجیب شے ہے۔ ذی مرتبہ راہنمایانِ قوم آسانی سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جدید فن اخلاق کے ماہرین کہتے ہیں کہ مصلحت بینی ہی فلاح اور ہر دلعزیزی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ یہ ماہرین فن اس خیال کے ہمراز ہیں کہ کفر و اسلام، حق و باطل، شرک و توحید، نور و حکمت، صداقت و کذب سب کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہئے، اگر حق گوئی کا حق اس طرح ادا ہو سکے کہ باطل کا دل بھی ہاتھ میں رہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ اہرمن و یزداں دونوں کو رام کیجئے، صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہئے، جب تبکدے سے بھی رسم و راہ قائم رہ سکے۔

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق ست با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

حضرت مولانا حق و باطل کے مابین کوئی نئی راہ تلاش نہیں کرتے، ان کا یقین ہے کہ حق کی حمایت کروگے تو باطل ضرور روٹھے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ حق و باطل دونوں کی رضا جوئی کی جائے، ان میں سے ایک کے دامنِ عافیت میں پناہ لینی ہوگی اور دوسرے کے دامن کو جھٹک دینا ہوگا۔ لہذا حضرتؒ نے اپنے لئے حق کی راہ متعین کی، اس لئے کہ یہی صلحاء و اتقیاء کی راہ مستقیم ہے۔ اس مقام پر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ذاتی تاثرات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"حق اور باطل دونوں آپ کے سامنے ہیں، انہی میں سے کسی ایک کو پسند کر لیجئے۔ اگر حق کی راہ اختیار کی ہے تو پھر مصلحت پیرایہ بیان طرز ادا، الفاظ شہد نما و معانی زہر آلود اور اسی قبیل کی تمام باتوں کے لئے نفاق کے سوا اور کوئی لقب نہیں، سچ کہئے گا تو جھوٹ کو چوٹ لگے گی، اسکو بچانے کی کوشش نہ کیجئے، ورنہ آپ کفر سے زیادہ دنیا کے لئے مہلک ہیں، نرمی و آشتی حسن ادا پیرایہ بیان، مصلحت بینی اور مقتضیات زمانہ کے اگر یہی معانی ہیں جو بتلائے جاتے ہیں، تو خدا کے لئے ہمیں سمجھائیے کہ پھر نفاق اور منافقی کی خصوصیات اور کیا ہیں۔؟ اگر ایک بات سچ ہے تو اس کو صاف صاف کہہ دیجئے اگر کچھ لوگ بُرے ہیں تو کھول کھول کر ان کی بُرائی بیان کر دیجئے، بری باتوں کے اظہار کے لئے اچھے لفظ کیوں اختیار کئے جائیں۔ بد اعمالوں کو کیا حق ہے کہ نیک کرداروں کے حقوق

کا مطالبہ کریں، اگر یہ طریقہ پسند نہیں تو پھر بتوں کو آستین میں چھپانے کی جگہ بہتر ہے کہ سر پہ جگہ دیجئے۔
ظاہر و باطن میں مطابقت جھوٹ میں بھی ہو تو سچائی سے خالی نہیں ہے

بس کافرست زاہد از برہمن ولیکن
او رابت ست در سر و را آستین ندارد

حضرت مولانا بت شکن تھے، بت گر یا بت فروش نہ تھے۔ آپ کا یہ اعلان کس قدر موزوں، جامع، مناسب اور متناسب ہے ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت اس وقت کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خان کر رہے تھے۔ حضرت مولاناؒ نے اس جابر وزیر اعلیٰ کی صدارت میں منعقدہ جلسہ عام میں کھری کھری باتیں سنائیں کہ اس کی جبین جبروت پر پسینہ آنے لگا۔ حضرت نے فرمایا:

"چائے کی ایک پیالی پر قلب وضمیر کا سودا نہ کرنا اور نہ ہی بسکٹ کی لذت بے مایہ کے عوض ٹوڈیوں اور خائنوں کو ووٹ دینا۔ بلکہ یہ ووٹ اس مستحق کو دو جو اسلام کی سچی تڑپ رکھتا ہو"

انقلابی حکومت کے اوائل میں اس قدر خوف وہراس مسلط تھا کہ ہم نے یار لوگوں کو رات کے نو بجے کے بعد گھر سے باہر نہ آتے دیکھا۔ اس سے پہلے نیم شب تک انجمن آرائی ہوتی، لیکن انقلاب کے آتے ہی روز و شب میں انقلاب آگیا۔ لوگ مارے خوف کے گھر سے باہر قدم نہ رکھتے تھے کہ کہیں بیگار میں پکڑے نہ جائیں لیکن حضرت مولانا سکوت وجمود کے اس دور میں بھی دہلی دروازہ کے باہر نوبت ابراہیمی کے زور سے تازہ خداؤں کا بھرم کھول رہے تھے۔ ■■

★ الحق ہر انگریزی مہینہ کی دس گیارہ تاریخ تک سپرد ڈاک کر دیا جاتا ہے۔
★ جن حضرات کو ۲۵ تاریخ تک بھی پرچہ نہ ملے تو وہ نمبر خریداری کے حوالہ سے ۳۰ تاریخ سے قبل دوبارہ رسالہ منگوا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
★ جملہ امور کیلئے خط وکتابت منیجر رسالہ سے کی جائے۔
★ جملہ خط وکتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا پورا پتہ اور نمبر خریداری صاف اور خوشخط ضرور لکھیں۔

جناب مولانا محمد حفیظ اللہ پھلواروی۔ کراچی

خاندان سور کے فرمانروا
شیر شاہ سوری اور سلیم شاہ
کا علمی شغف

مسٹر کین نے لکھا ہے کہ کسی حکومت حتیٰ کہ برطانیہ نے بھی اس پٹھان کی سی دانشمندی کا اظہار نہیں کیا۔ مسٹر ڈبلیو کروکس نے لکھا ہے کہ شیر شاہ رعایا کی مرضی پر سلطنت قائم کرنے والا پہلا شخص تھا۔

فرید خاں سور نے ہمایوں کو شکست دے کر "شیر شاہ" کے لقب سے مسند حکومت ہند و پاک کو رونق بخشی۔ خاندان سور کی حکومت کا بانی یہی شیر شاہ ہے۔

شیر شاہ نے جون پور میں جو ان دنوں علوم و فنون کا بڑا مرکز تھا، تعلیم پائی۔ یہاں اس نے کافیہ مع حواشی اور عربی صرف و نحو کے چند مختصر دوسرے رسالے اور فارسی میں گلستان بوستاں اور سکندر نامہ پڑھے۔ اس کا زیادہ وقت مدرسوں اور خانقاہوں میں گزرتا، جہاں وہ علماء اور صلحاء کی صحبت سے استفادہ کرتا، اور اخلاق حمیدہ کی تحصیل و تہذیب میں مصروف رہتا۔

شیر شاہ کو دینیات اور ادبیات کے علاوہ فلسفہ اور تاریخ سے بھی دلچسپی تھی۔ عباس سروانی کے قول کے مطابق شیر شاہ "کتب سیر ملک ملوک ماضیہ اوقات مطالعہ می کرد"۔

پروفیسر سید حسن عسکری آف پٹنہ کالج کے بیان کے مطابق "پادشاہاں گذشتہ کی تاریخ کا مطالعہ شیر شاہ کے بہت کام آیا۔ جو اچھی باتیں اپنے پیش رؤں کے عہد حکومت میں اس نے کتابوں میں پائیں اسے اپنانے اور حالات زمانہ اور اپنی قوم کے طبائع کے موافق اسے ڈھالنے میں اپنی کوششیں صرف کیں۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں شیر شاہ جنگ و جدل، فتوحات و توسیع سلطنت

سے زیادہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، فہم و تدبر، سیاست اور تعمیری صلاحیتوں اور استحکام و توانین، امن و امان کے لیئے وحید الزماں اور فقید المثال تھا۔ اس کا مختصر دور حکومت نظم و نسق، مالی و زمینی بندوبست، آسودگی رعیت و سپاہ، امنیت راہ، امور رفاہ عام، فوجی اصلاحات معموری و ضبط مملکت، دفعیہ ظلم و تعدی، انسداد فسق و فجور، پرہیزگار، علم پروری کے اعتبار سے نہ صرف یادگار زمانہ بلکہ آنے والوں کے لیے مشعل راہ تھا۔

شیر شاہ نے اپنے اوقات مقرر کر رکھے تھے۔ آخر شب میں بیدار ہوتا، تہجد ادا کرتا، ایک گھڑی تک تعقیبات صلوٰۃ میں مصروف رہتا۔ پھر مختلف شعبوں کے کاغذات دیکھنا اور ان کے سربراہوں کو ہدائتیں دیتا۔ بعد ازاں نماز فجر با جماعت ادا کرتا اور اوراد میں مصروف ہو جاتا۔ اس کے بعد ارکین دولت کی پیشی ہوتی۔ نماز اشراق کے بعد عوام کی عرضیاں دیکھنا، اور محتاجوں کی امداد کرتا۔ پھر امراء، واعیان دولت و سفراء حکومت و وکلائے سلطنت کی ملی جلی مجلس قائم ہوتی۔ عمال حکومت کی موصول شدہ درخواستیں پیش ہوتیں، ان کے جواب لکھواتا۔ اس کے بعد دستر خوان پر بیٹھتا۔ یہاں اس کے ساتھ علماء و مشائخ بھی ہوتے۔ دوران طعام ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو بھی کرتا۔ نماز ظہر با جماعت ادا کرنے کے بعد قرآن پاک تلاوت کرتا، پھر سلطنت کے امور پر گفتگو کرتا۔

شیر شاہ پہلا بادشاہ ہے جس نے سلطان علاؤ الدین خلجی کے بعد بادشاہی کے قانون وضع کیئے اور ان میں اپنے بعد کے آنے والوں کے لیئے دستاویز کی صورت میں چھوڑ گیا۔ اس کے ساتھ فوجی توانین بھی مدوّن کیئے اور ان کی تنظیم کے لیئے جدید اسلوب وضع کیئے۔ اس نے مالی قانون بھی مقرّر کیئے جن کا تعلق سکہ جات اور دوسرے اقتصادی امور سے تھا۔

شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا، اس کے عدل و انصاف کی ایسی دھاک بیٹھی تھی کہ ایک بڑھیا بھی اگر جنگل میں سونے کا تھال اچھالتی چلتی تو کسی کی مجال نہ تھی کہ اسے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھ سکے ——— یہ شیر شاہ کی عادت تھی کہ جب کبھی کوئی عالم اس کی خدمت میں مدد معاش کے لیئے آتا تو وہ اس سے عموماً "حاشیہ بندی" کے متعلق سوالات کرتا، کیونکہ اسے تاریخ و سیر کی کتابوں سے بہت شغف تھا۔

شیر شاہ نرا سپاہی، منتظم، مدبّر اور سیاست دان ہی نہ تھا، بلکہ پاکیزہ ذوق سخن بھی رکھتا تھا۔ اور کبھی کبھی برجستہ شعر بھی کہتا تھا۔ چنانچہ جنگ (؟) کے موقع پر جب ہمایوں نے عالم مایوسی میں گھبرا کر اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ اور ڈوبنے لگا تو اگرچہ سقے نے مدد کی اور دریا پار کرا دیا مگر اسکی پوری فوج تہس

نہیں ہوگئی۔ بیشتر سپاہی اور سردار غرق دریا ہوگئے۔ اس عظیم کامیابی نے شیر شاہ کے لئے آگرہ تک راہ صاف کردی۔ اس موقع پر اس نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

فرید حسن را تو شاہی دہی سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

اس کے استاد نے اس کی اس طرح اصلاح کی۔

یکے را بر آری و شاہی دہی سپاہ ہمایوں بہ ماہی دہی

بڑے بڑے اہل کمال شیر شاہ کے دربار میں موجود تھے۔ ان میں ملّا نظام الدین دانش مند شیخ جلیل مرشد، قاضی فصیح الدین، شیخ عبدالحیؒ شاعر قابل ذکر ہیں۔

شیخ مبارک بنارسی جو اپنے عہد کے ممتاز محدّث تھے، شیر شاہ کے دربار میں عہدۂ وزارت پر مامور تھے۔ شیخ بدہ بہاری استاد فاضل اور طبیب حاذق تھے۔ شیر شاہ نہایت اعتقاد سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ انہوں نے قاضی شہاب الدین دولت آبادی کی کتاب ارشاد کی ایک عمدہ شرح لکھی ہے۔

ملک محمد جائسی ۹۴۷ھ میں بھاکا زبان میں اپنی بے نظیر کتاب "پدماوت" شیر شاہ کے نام پر لکھی، اس میں بادشاہ کی تعریف اس بیت سے شروع کی ہے۔

شیر شاہ دہلوی سلطانوی چار ہند کھنڈ تپتے جس بھانوں

ترجمہ: شیر شاہ دہلی کا بادشاہ ہے (اور اس کے نام سے) چار دانگ عالم مہر عالم تاب کی مانند روشن ہے۔

شیر شاہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "بادشاہ کو لازم ہے کہ وہ علماء اور فضلاء کی مدد معاش مقرر کرے۔ کیونکہ ہندوستان کے شہروں کی رونق اور آبادی ان ہی لوگوں سے ہے جو طالب اور مسافر بادشاہ تک نہیں پہنچ سکتے وہ ان سے فیض پاتے اور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان سے حکمت و دین کے علوم کی رونق ہوتی ہے۔

شیر شاہ فرصت کا وقت علماء کی صحبت میں گزارتا تھا اور اکثر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا کرتا تھا۔ اس نے نارنول (ضلع پٹیالہ) میں ایک شاندار دارالعلوم قائم کیا جو "شیر شاہی مدرسہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں طلباء کو شاہی خزانہ سے وظیفے ملتے تھے۔ اس سلسلہ کا ایک کتبہ اب تک موجود ہے جس میں مدرسہ کی تعمیر کی تاریخ ۹۲۷ھ (مطابق ۱۵۲۰ء) کندہ ہے۔

نارنول، حصار اور جے پور کے درمیانی ریلوے اسٹیشن باول سے ۲۲ میل جانب مغرب

میں واقع ہے۔ یہ دانش گاہ شہر کی عظیم الشان عمارتوں میں سے ایک تیار کی گئی تھی۔ یہاں شیر شاہ کے پردادا حسن سوری کا مقبرہ بھی واقع ہے۔ اسے شیر شاہ نے ایک لاکھ روپے کے صرفہ سے تعمیر کیا تھا۔

نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندو رعایا میں بھی تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے اور اسکی اشاعت کی غرض سے شیر شاہ نے انہیں جاگیریں عطا کی تھیں، چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرشاد تحریر فرماتے ہیں کہ :

"شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیریں وقف کیں، ان کا انتظام خود ہندو ہی خود آزادانہ طور پر کرتے تھے۔ شیر شاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ میں مقبول تھا"

ایشوری پرشاد لکھتے ہیں :

"شیر شاہ اپنی ہندو رعایا میں تعلیم سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اوقاف کئے تھے اور ان کا انتظام ان ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ اس قسم کی فیاضانہ پالیسی نے اسے اپنی ہر مذہب وملت کی رعایا میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا"

شیر شاہ کے عہد حکومت میں بہت سے ہندوؤں نے فارسی پڑھ پڑھ کر دکن کی طرح شمالی ہندوستان میں بھی دفاتر سرکاری میں نوکریاں حاصل کیں۔ راجہ ٹوڈر مل شیر شاہ ہی کا تربیت یافتہ تھا، اور اس کے محکمۂ مال گذاری کا دیوان تھا۔ اس نے فارسی سیکھی اور دربار تک رسائی پائی۔ شیر شاہی کاروبار درہم برہم ہوجانے کے بعد وہ اکبری نورتن میں شامل ہوا۔

شیر شاہ کی مرکزی حکومت میں تقریباً ایک درجن کاتب اس کا ہاتھ بٹاتے تھے اور اس کے حکموں کو نافذ کرتے تھے۔ عنانِ حکومت کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا اور کبھی کوئی کمزوری نہ آنے دی۔ قاضیوں کی تعداد سارے ملک میں ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ۹۰ صدر قاضی بھی تھے۔ ڈاک کی چوکی پر کافی دھیان تھا۔ اور اس کا اچھا انتظام تھا۔ شاہی باورچی خانہ علماء، فضلاء، فقراء، محتاجوں کے لئے کھلا رہتا تھا۔

شیر شاہ کے موجودہ زمانے کے مورخ ڈاکٹر قانون گو نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ابوالفضل کی حیرت انگیز ادبی صلاحیتوں اور کوششوں نے جو عظیم الشان خسروی عمارت کھڑی کردی ہے اس سے دنیا کو مغالطہ ہوا کہ اس کا واحد معمار اس کا اپنا ولی نعمت و آقا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر اعظم کے انتظامات سلطنت میں شیر شاہی کارناموں کا بڑا دخل ہے۔

ڈاکٹر ترپاٹھی نے خیال کیا ہے کہ نظم ونسق قانون امن وامان معموری مملکت اور امور رفاہ عام کے اجراء میں شیر شاہ کی حیثیت ایک مصلح کی تھی نہ کہ مخترع کی۔

مسٹر ڈبلیو کروکس کا بیان ہے کہ "شیر شاہ پہلا شخص تھا جس نے ایک سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی جو رعایا کی مرضی پر مبنی ہو" مسٹر کین نے لکھا ہے کہ: "کسی حکومت حتیٰ کہ برطانیہ نے بھی اس پٹھان کی سی دانشمندی کا اظہار نہیں کیا"

شیر شاہ کو یہ ملال رہا کہ یہ سلطنت اُسے ضعیفی میں ملی، وہ کہا کرتا تھا کہ اگر زمانہ میرے ساتھ موافقت کرتا تو میں خلیفۃ المسلمین کو یہ تجویز پیش کرتا کہ وہ فارس پر اُدھر سے یلغار کرے اور میں ادھر سے تاکہ اُن اوباشوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے جو حاجیوں پر حملہ کر کے ان کا اسباب لوٹ لیتے ہیں۔ اور ہم دونوں مل کر مکہ معظمہ کے لئے ایک ایسی شاہ راہ بنواتے جو ان رہزنوں کے خطرات سے محفوظ ہوتی، مگر اس کے مسودات مکمل ہونے سے پہلے موت نے اسے سلا دیا۔

شیر شاہ نے سید رفیع الدین محدث سے اپنا یہ ارادہ ظاہر کرنے کے بعد کہا تھا کہ وہ اس مہم کے لئے انہیں اپنا وکیل بنا کر شاہ روم کے پاس سفارت دے کر روانہ کرے گا۔ شیر شاہ پچاس جہاز کے دو بیڑے تیار کرانا چاہتا تھا، تاکہ ان میں ہندوستان سے مکہ معظمہ جانے والے عازمین حج کے کام میں لایا جا سکے۔

شیر شاہ کی بنائی ہوئی سڑکیں اور ہر دو کوس کے فاصلہ پر پختہ سرائیں بہت مشہور ہیں، اور ان میں سے بعض کے آثار اب تک موجود ہیں۔ اس نے دہلی کے قلعے میں مسجد بنوائی جو اب تک اچھی حالت میں ہے۔ یہ مسجد دور افغانی کی آخری عمارتوں میں بڑے پایہ کی عمارت ہے، اس کے قریب برج کی شکل کا "شیر منڈل" بنوایا۔ شیر منڈل ہشت پہلو دو منزلہ عمارت ہے جس کے اوپر ایک برجی بنی ہوئی ہے۔

ایڈورڈ گبرٹ لکھتا ہے کہ: "بہت کم لوگوں نے پانچ سال کی قلیل مدت میں اتنے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہونگے کہ اس لائق اور فرض شناس انسان نے انجام دیئے۔"

شیر شاہ کالنجر کے قلعے کے محاصرے کے دوران بارود میں آگ لگ جانے سے بری طرح جھلس گیا۔ اور قلعہ کی فتح کی خبر کے بعد ۲۲ مئی ۱۵۴۵ء کو جان جان آفرین کے سپرد کی۔

شیر شاہ کے عظیم کارناموں کو دیکھتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا مبالغہ نہیں کہ ہند و پاکستان کے مسلم حکمرانوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور چند فرمانرواؤں کو چھوڑ کر برعظیم کی تاریخ میں اس کا مثل نہیں ملے گا۔ اقبالؒ کا یہ شعر اس پر سب سے زیادہ صادق آتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شیر شاہ کا بیٹا جلال خان ۱۵ر ربیع الاول ۹۵۲ھ کو "سلیم شاہ" کے لقب سے تخت نشین ہُوا۔ اپنے باپ کی طرح سلیم شاہ کو بھی علم کا ذوق تھا۔ وہ فی البدیہہ اشعار کہہ سکتا تھا۔ وہ علماء سے جن میں ممتاز ابوالحسن کمبوہ اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری ہیں۔ اکثر ملاقات کرتا تھا۔ (تاریخ جہاں جہاں قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی) شیخ علائی اس زمانہ کے مشہور فاضل شخص تھے۔

بدایونی کے بیان کے مطابق وہ اس مقولے پر عمل کرتا تھا: "محنت اور تندہی کیساتھ متواتر تحصیل علم میں لگا رہنا ضروری ہے۔ دن میں بحث و مباحثہ کے ذریعہ علم میں اضافہ کرے اور رات کو مزاولت کتب کے ذریعہ۔"

بدایونی کے بیان کے مطابق سلیم شاہ کو شعر و شاعری کا بڑا ذوق تھا۔ اسے ہر قسم کے بکثرت اشعار یاد تھے۔ اکثر نعمت اللہ اشعری سے شعر و سخن پر مباحثہ کرتا تھا۔ سمجھ بوجھ کے لحاظ سے نہایت ذہین تھا۔ اکثر لطیفے کہا کرتا تھا اور دوسروں کے لطیفے سن کر بہت محظوظ ہوتا تھا۔ علماء و صلحاء سے بھی عقیدت رکھتا تھا۔

صاحب نزہۃ الخواطر مولانا عبدالحئی حسنیؒ کہتے ہیں کہ شہروں کی تاسیس، زراعت کی بہتات عوام کی خوش حالی، رعیت کے ساتھ حسنِ سلوک اور مساجد میں مسلمانوں کے ساتھ ادائے نماز میں سلیم شاہ اپنے باپ کا مثنیٰ تھا۔ علماء کا احترام کرتا، ان کی مالی اعانت سے عزت حاصل کرتا اور وقت بے وقت ان کے ساتھ علمی مذاکرات میں دلچسپی لیتا۔ نشہ آور اشیاء سے اسے رغبت نہ تھی۔ اس نے اپنے لشکریوں کے لئے بعض ایسے قوانین وضع کئے جو اپنے والد کے قوانین میں اضافہ تھے۔ ہر پچاس فوجیوں پر ایک ایسا سردار مقرر کیا جو فارسی جانتا ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک منشی ہندی جاننے والا مقرر کیا۔ اسی طرح ہر لشکر میں دو قاضی مقرر کئے۔ ایک ہندوستانی اور ایک افغانی۔"

منتخب التواریخ میں تحریر ہے کہ "سلیم شاہ نے ہر سرکار میں حکم نامے جاری کئے، ان میں دینی دنیاوی، جزوی، کلی، مالی اور ملکی تمام معاملات کے متعلق قوانین درج تھے، اور ان طریقوں کی وضاحت تھی جن کے مطابق فوج و رعیت اور تاجروں کو معاملات کرنا چاہیئے۔ حکام کے لئے تفصیلی لائحہ عمل درج تھا جس میں تمام امور کے بارے میں قوانین لکھ دئے گئے تھے۔ یہ لائحہ عمل اتنا مکمل تھا کہ اس کے بعد حکام کو بہت کم ضرورت پڑتی تھی کہ وہ کسی معاملہ میں قاضی یا مفتی سے دریافت کریں۔"

مخدوم الملک شیخ عبداللہ سلطان پوری سلیم شاہ کے عہد میں مذہبی امور کے صدر الصدور تھے۔

میاں عبدالحی المتخلص بہ حیاتی سلیم شاہ کے مصاحب و ندیم تھے۔ ان کی سخن وری، ظرافت طبع اور فیاضی کی شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور مصنف "مخزن افغانی" نے تعریف کی ہے۔

شیخ مبارک اودی کو پٹھانوں میں بہت مقبولیت حاصل تھی، سلیم شاہ آپ کی مجلس میں حاضر ہو کر برکت کا خواہاں ہوتا۔ اور آپ کی نعلین اٹھا کر سامنے رکھتا۔

شیخ رزق اللہ مشتاقی اسی زمانے کے ایک مشہور شاعر تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فارسی کے علاوہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ہندی شاعری میں ان کا تخلص "راجا" تھا۔ دوسرے بلند مرتبہ ادیب مثلاً سید منجھن، شاہ محمد، سیفی، سورداس وغیرہ سلیم شاہ کیساتھ رہتے تھے۔ سلیم شاہ کو علم وادب میں خاصی دلچسپی تھی۔ وہ ادبار اور علماء کی رہائش گاہ کے لئے ایک بڑا خیمہ اپنی قیام گاہ کے قریب لگواتا تھا۔ ان حضرات کا مشغلہ نظمیں سنانا اور ادبی اور فلسفی موضوعات پر مباحثے کرنا تھا۔ سلطان ان حضرات کی بہت قدر و منزلت کرتا تھا۔

سلیم شاہ نے ایک قلعہ سلیم گڑھ ۱۵۴۶ء میں دریائے جمنا کے بیچ میں ایک چٹان کے اوپر بنوایا جو اب بھی لال قلعے کے کونے پر موجود ہے۔ سلیم گڑھ کی تعمیر سے ایسا قلعہ بنانا مقصود تھا۔ جو فتح نہ ہو سکے۔ اس عہد میں عیسیٰ خان کا مقبرہ اور مسجد بنے جو ہمایوں کے مقبرے کے قریب واقع ہیں۔ سلیم شاہ کا انتقال ۱۵۵۳ء میں ہوا۔

سال رواں میں دارالعلوم کے شعبۂ عربی کے طلباء کی علاقائی تفصیل

پاکستان اور ملحقہ ریاستیں					
		گلگت	۳	لہگرد	۱۱
پشاور	۴۴	وزیرستان	۱۲	قندوز	۱۴
مردان	۲۲	کرم ایجنسی	۳	قطغن	۲
بنوں	۱۵	مہمند ایجنسی	۱۵	وردگون	۲۰
ڈیرہ اسماعیل خان	۱۵	مالاکنڈ ایجنسی	۴	ہرات	۳
کوہاٹ	۷	تیراہ	۴	گردیز	۱۵
ہزارہ	۲۸	کیمبلپور	۵	بغلان	۱۱
سوات	۱۲	**افغانستان**		نورستان	۷
بنیر	۳	جلال آباد	۵	**ایران**	
چکیسر	۱	ننگرہار	۶	خواف	۱
دیر	۹	غزنی	۲۰	بیرجند	۱
باجوڑ	۸	پروان	۱۰	بلوچستان	۱
بلوچستان		قندہار	۲۲	بدخشان	۳
سبی	۱۶	خوست	۱۳		
لورالائی	۱۲	کنڑ	۵	**تھائی لینڈ**	
کوئٹہ	۱۸	لغمان	۶	بنکاک	۱
ژوب	۱۰	ترکستان	۱۳		
چترال	۵	خراسان	۹	مجموعی تعداد تا ۱۵ ذی قعدہ	۴۸۰
		قلات	۱۰		

جناب احمد سعید صاحب ایم اے ۔ لاہور

مولانا محمد علی جوہرؒ اور مولانا تھانویؒ

مولانا تھانویؒ نے کبھی بھی مغربی طرز حکومت کی حمایت نہیں کی ایک مرتبہ آپ نے مغربی جمہوریت کیلئے مغربی بدعت کا لفظ استعمال کیا۔

مولانا محمد علی جوہرؒ تحریکِ خلافت کی روحِ رواں تھے۔ دوسری جانب مولانا اشرف علی تھانویؒ کو تحریکِ خلافت سے اختلاف تھا۔ مولانا محمد علی گاندھی کے ساتھ تعاون کر رہے تھے، مولانا تھانوی گاندھی کو عیّار، دجّال، شیطان، طاغوت کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔

تحریکِ خلافت کے دوران مولانا محمد علی نے مولانا تھانوی سے ملاقات کیلئے تھانہ بھون آنے کی خواہش ظاہر کی۔ مولانا تھانوی نے فرمایا: "مسٹر محمد علی یہاں سر آنکھوں پر آئیں، مگر چند شرائط میں ان کو میں پہلے سے اس لئے واضح کر دیتا ہوں کہ کبھی ان کے آنے کے بعد ان کو خیال ہو کہ کس دیہاتی سے پالا پڑا ہے۔ اس لئے جو ضروری باتیں ہیں صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ اوّل شرط یہ ہے کہ مجھ کو آنے سے پہلے تبلادیں کہ کس غرض سے آ رہے ہیں، آیا ملاقات مقصود ہے یا کچھ اور۔ اگر مطلق ملاقات مقصود ہے تو شرائط میں کمی ہوگی، ورنہ شرائط زیادہ ہوں گی۔ میں اسی وقت وہ بھی بیان کئے دیتا ہوں تاکہ وہ غور کر سکیں پھر جیسی رائے ہو عمل کریں۔ سو اوّل شرط یہ ہے کہ آنے سے قبل آنے کی غرض تبلادیں۔ دوئم یہ کہ جس وقت یہاں آئیں گے میں ان کے لئے بہ جزبارہ اوّل کے بار بار کھڑا نہ ہوں گا۔ سوئم یہ کہ زمانہ قیامِ خانقاہ میں ان کو کسی اور سے گفتگو کی اجازت نہ ہوگی۔ یہ ہیں شرائط اگر یہ منظور ہوں تو بسم اللہ ان کا اپنا گھر ہے، تشریف لے آئیں۔"

مولانا تھانویؒ نے کبھی بھی مغربی طرزِ حکومت کی حمایت نہیں کی۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ آپ

نے مغربی جمہوریت کے لئے مغربی بدعت کا لفظ استعمال کیا۔ مولانا محمد علی نے جب یہ تحریر پڑھی تو انہوں نے اس سلسلہ میں ایک مضمون تحریر کیا۔ مولانا محمد علی نے لکھا: "حجاز کی مقدس سرزمین پر ایک عہد شکن بادشاہ (شاہ سعود) کے قبضہ جما لینے پر مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کا دل اس قدر باغ باغ ہوا کہ وہ جمہوریت کو مغربی بدعت کہنے لگے۔ اور سلطان ابن سعود کی مطلق العنانی کو عین اسلام ظاہر کرنے لگے اور چونکہ وشاورھم فی الامر کی نص صریح سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ اس لئے امر کو جس وقت ضرورت کے تحت کھینچا جا سکتا ہے۔ تاویل کے ذریعہ سے نص صریح کی بے ادبی کی گئی اور فرمایا گیا کہ جی ہاں وشاورھم فی الامر تو صحیح ہے مگر یہ ولایت کے پڑھے ہوئے جو مولانا بن بیٹھے ہیں یہ بھول گئے کہ وان عزمت[1] فتوکل علی اللہ۔ ایسے بلند پایہ عالم کے قلم سے جب ایسی تاویلیں نکلیں تو کس طرح مسلمانوں کی حالت پر رونا نہ آئے۔ تعجب ہے کہ مولانا جو خود ولایت کے نہیں پڑھے ہوئے ہیں۔ اور جنہیں فرنگی محل نے بھی مولانا کا خطاب عطا نہیں کیا ہے، ان الفاظ کو یاد رکھا۔ مگر یہ بھول گئے کہ وان عزمتم نہیں ہے بلکہ وان عزمت ہے اور یہ خیال نہیں فرمایا کہ عزمت کی ضمیر سلطان ابن سعود جیسے غیر معصوم خاطی بادشاہ کی طرف نہیں پھرتی۔ بلکہ ایک معصوم اور غیر خاطی نبی سردار کونین کی طرف پھرتی ہے، جس کا عزم بالجزم سوائے خدا کے کسی کی مدد کا محتاج نہیں تھا۔"

مولانا تھانوی سے صدق جدید کے ایڈیٹر مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی بہت عقیدت تھی۔ مولانا محمد علی اس سے واقف تھے اور اکثر ان سے دریافت فرماتے تھے کہ "ہمارے تھانیدار صاحب کا کیا حال ہے۔"

مولانا تھانوی جب بھی ہندوؤں کی بدعہدی کا حوالہ دیتے تھے تو مولانا محمد علی کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ مولانا محمد علی کے متعلق مولانا تھانوی نے فرمایا: "تمام لیڈروں میں سب سے پیارے محمد علی کے اندر یہ بات تھی کہ وہ مہذب تھے۔ اسی زمانہ میں میں نے معتبر راوی سے سنا تھا کہ علی گڑھ کالج میں نماز کے بعد میرے لئے یہ دعا کرائی تھی کہ یا اللہ اس ہستی کو ہمارے ساتھ کر دے۔"

فرمایا: ہاں محمد علی سے باوجودیکہ وہ اس (تحریک خلافت) کے بانی ہیں مجھ کو محبت ہے، ایک تو وہ مہذب اور خوش نیت تھے، دوسرے اس وجہ سے کہ وضوح حق کے بعد اہل باطل کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔"

---

[1] آیت میں واذا کا لفظ ہے۔ (ادارہ)

کانگریس کے تلخ تجربوں کے بعد مولانا محمد علی جب کانگریس سے علیحدہ ہوئے تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ۱۹۳۰ء میں اس بات کی کوشش کی کہ دونوں رہنماؤں کے درمیان کوئی صورت مصالحت ہوجائے۔ ایک روز مولانا عبدالماجد نے موقعہ پاکر مولانا تھانویؒ سے عرض کیا کہ "حضرت ایک مرتبہ تو ملاقات حضرت اور مولانا محمد علی کے درمیان ہوجائے۔ حضرت توسفر کرنے سے رہے اجازت ہو تو ان ہی کو لے آؤں۔" فرمایا: ارے تہیں وہ بڑے آدمی ہیں، یہاں کہاں آئیں گے۔ یہاں آنے کی دعوت دینا ہرگز مناسب نہیں، انہیں بڑی زحمت ہوگی۔" مولانا دریا آبادی نے فرمایا: اس سے حضرت کو غرض کیا، بلانے والا تو میں ہوں، ان کے آنے کی ذمہ داری ساری میرے سر ہے۔" فرمایا: "عرصہ ہوا فلاں صاحب نے بھی یہ تحریک کی تھی، میں نے پہلے بھی یہی جواب دیا تھا کہ میری تجویز یہ ہے کہ ایک رات خانقاہ میں گذاریں پہلے دن جب وہ تشریف لائیں گے تو میں اٹھ کر ان کی تعظیم کروں گا عزت سے اپنے پاس بٹھاؤں گا، لیکن اتنی عنایت وہ کریں کہ وہ مسائل پر اس روز گفتگو نہ کریں، بلکہ میرے معروضات بڑی خاموشی سے سنیں۔ شب میں آرام کریں۔ طبیعت کو خلوت ذہن کے ساتھ میرے معروضات کو سوچنے کا موقعہ دیں۔ پھر دوسرے روز جو چاہیں اور جتنی دیر چاہیں ارشاد فرمائیں میں بھی اسی خاموشی کے ساتھ سننے کو تیار رہوں"

اب مولانا تھانویؒ راضی ہوگئے، چنانچہ مولانا دریا آبادی نے مولانا محمد علی کو بھی نیم راضی کر لیا لیکن قدرت کو یہ ملاقات منظور نہ تھی اور اس کے بعد مولانا محمد علی کا انتقال ہوگیا۔

مولانا محمد علی کا انتقال ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو ہوا۔ مولانا تھانوی کو جب مولانا کے انتقال کا علم ہو تو مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام ایک تعزیتی خط لکھا جس سے ان کے دلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ مولانا تھانویؒ لکھتے ہیں :

مکرمی السلام علیکم ——— محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہوا ہے بیان نہیں کر سکتا ہوں۔ خدا جانے کتنی بار دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں۔ مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد اور اس اعتقاد کی بنا پر محبت ہے صرف ایک صفت ہے مسلمانوں کی سچی اور بے غرض محبت ——— باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہوں گے میں اسکو روح الصفات سمجھتا ہوں۔ ★

فوّارہ مارکہ
اعلیٰ قسم کا
سوتی دھاگہ
سنگل اور فولڈڈ
۱۰ کاؤنٹ سے ۴۰ کاؤنٹ تک
ہینکس کے علاوہ کونز پر بھی دستیاب ہے
FOUNTAIN BRAND
فوارہ مارکہ
D. M. TEXTILE MILLS LTD.
تیار کنندگان
ڈی۔ایم۔ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ
ہیڈ آفس: ... ایکسچینج بلڈنگ — پوسٹ بکس نمبر ۴۶۱۷ — کراچی
تار کا پتہ: DOSTCOT — فون ۲۳۱۳۴۰ — ۲۲۳۹۱۳
ملز: سٹی چھاؤنی — پوسٹ بکس ۵۲ — راولپنڈی
تار کا پتہ: FINETEX — فون ۶۲۷۵۵ - ۶۶۹۳۲ - ۶۲۷۵۵